نقوش

ادبی معرکے نمبر



www.taemeernews.com

دو اور زندہ رہنے والے نمبر

انیس نمبر

اس نمبر میں پہلی بار انیس کے ۲۴ غیر مطبوعہ مرثیے پیش کیے جا رہے ہیں اور ۲۴ مرثیوں میں غیر مطبوعہ بندوں کی تعداد ۱۶۱ ہے ۔ دنیائے ادب اس نمبر کی نظیر پیش نہ کر سکے گی ۔ یہ نمبر اکتوبر ۱۹۸۱ء میں بازار میں آجائے گا ۔

صفحات : ۷۲۸

اقبال نمبر (۳)

یہ نمبر اقبال کی غیر مطبوعہ اور غیر فانی تحریروں پر مشتمل ہے ۔ اس نمبر کی اشاعت کے بعد ، اقبال کو نئے زاویوں سے دیکھنے کا موقع ملے گا ۔ اس نمبر کو اقبالیات کے سلسلے میں قابل احترام مقام حاصل ہوگا اور ہماری یہ کاوش عرصہ پانچ سال کا ثمر ہے ۔ یہ نمبر بھی نومبر ۱۹۸۱ء میں پیش کر دیا جائے گا ۔

www.taemeernews.com

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲ ٹیلیفون نمبر ۵۳۵۲۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

ادبی معرکے نمبر

(۱)

شمارہ: ۱۲۷ ستمبر ۱۹۸۱ء

مدیر:

محمد طفیل

ادارۂ فروغِ اردو ○ لاہور

عام ایڈیشن
قیمت ۹۰ روپے (دونوں جلدیں)

لائبریری ایڈیشن
قیمت ۱۵۰ روپے (دونوں جلدیں)

www.taemeernews.com

ترتیب

www.taemeernews.com

باب سوم ، تحقیق کے نام پر معرکے

باب چہارم ، شعر وادب کے نام پر معرکے

www.taemeernews.com

باب پنجم، موضوع زیر بحث پر مقالے

www.taemeernews.com

طلوع

آج عید کا دن ہے۔ لوگ اپنے اپنے انداز میں خوشیاں منائیں گے۔ میں تو زیادہ تر وقت نقوش کی رفاقت میں گزاروں گا۔ کیونکہ میری عید اُس دن ہوتی ہے جس دن نقوش کا کوئی نمبر مکمل ہوتا ہے۔ جتنی عیدیں میں نے منائی ہیں کم کسی نے منائی ہونگی۔ کیونکہ میری تو یہ ۱۲۷ ویں عید ہے۔

میں نے نقوش کی ہر پیش کش کے وقت یہ بھی سوچا کہ میں جو نمبر چھاپ رہا ہوں اس کی ضرورت ہے کہ نہیں؟ ایسا میں اس لیے سوچتا ہوں کہ کسی طور، اگر میں اپنے آپ کو مطمئن کرسکوں کہ ضرورت نہیں ہے تو میں اُس ذہنی کرب سے بچ سکوں گا۔ جس سے کہ مجھے دوچار ہونا پڑے گا۔ چنانچہ سوچ کے پہیئے چلتے ہیں۔

"ضرورت ہے"

"ضرورت نہیں ہے"

ذہنی گھسائی میں اگر جواب ضرورت نہیں ہے والا درست لگا تو مارے خوشی کے عجیب عجیب حرکتیں کرتا ہوں۔ سیٹی بجاتا ہوں۔ فضول خرچی کرتا ہوں۔ کسی کو چھیڑتا ہوں۔

اگر جواب ضرورت ہے والا درست لگا تو پریشان ہو جاتا ہوں۔ اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ نظر آتا ہے۔ سال چھ مہینے کی سزا ہو گئی۔ وہ بھی بامشقت اور بارو پیہ!

سوال یہ ہے کہ جب یہ کام ذہن پہ اتنا بار ہے تو پھر کیوں زندگی تجے بیٹھا ہوں؟ جوانی نذر کر دی تو باز نہ آیا۔ صحت شادی تو باز نہ آیا۔ آنکھوں کا نور دیا تو باز نہ آیا۔ آخر کیوں؟ جواب کبھی نہ ملا۔

آپ کو معلوم ہے کہ دماغ تیزی سے سوچتا ہے۔ سوچوں میں ربط بھی نہیں ہوتا۔ منٹ میں وہ اپنے گھر اور اپنے ملک کے بارے میں سوچتا ہے تو دوسرے لمحہ وہ امریکہ یا روس پہنچ جاتا ہے۔ زقندیں بھرنے میں اس کا نہ تو کوئی اصول ہے اور نہ منطق، یہی وجہ ہے کہ وہ روز روشن کو بھی گھپ اندھیرے کی صورت میں دیکھ لیتا ہے۔

ایسے اُلٹ پھیر کے لمحوں میں، میں اپنے طاقچہ کی طرف دیکھتا ہوں۔ اپنی موم بتی کو اپنی دیا سلائی سے روشن کر لیتا ہوں۔

محمد طفیل

www.taemeernews.com

اس شمارے میں

یہ نمبر ادب کا ایک ضروری باب ہے۔ اگر ہم اس سے پہلو تہی کرتے تو ادب کی ایک دو سیڑھیوں کو کھسکا دینے کے مرتکب ہوتے۔ ضرورت تھی کہ اس نازک مگر اچھوتے موضوع کے سلسلے میں بے اعتنائی کے گنبد سے نکلتے۔

نوک جھونک ادبی نہج پر ہو تو ادب نکھرتا ہے۔ سنورتا ہے۔ اگر ذاتیات کی سیڑھیاں چڑھ جائے تو طعن و تعریض، سب و شتم اور جنگ و جدال تک نوبت پہنچتی ہے۔

اس نمبر کا پہلا باب زبان کے بارے میں ہے۔ متحدہ ہندوستان میں بحث یہ چل نکلی تھی کہ اس ملک کی مشترکہ زبان کون سی اور کیسی ہو۔ اس معرکے میں اہم شخصیتوں نے حصہ لیا تھا جن میں مولوی عبدالحق، ابوالکلام آزاد، مہاتما گاندھی، جواہر لعل نہرو، دتاتریہ کیفی، منشی پریم چند، مسعود حسن رضوی زیادہ اہم نام ہیں۔ ہم نے ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے مواد کو چند سو صفحات میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ ذہنوں میں خاکہ تو ابھر سکے۔

دوسرا باب جو اُردو کی جنم بھومی کے بارے میں ہے۔ اس کے سلسلے میں بھی پنجاب، دکن، دلّی، بہار، بنگال، گجرات اور میسور مدعی اس امر کے ہیں کہ اُردو کی ابتدا ہمارے صوبے سے ہوئی۔ ہر صوبہ اپنی اپنی دلیلیں لایا۔ برسوں بحثیں چلتی رہیں۔ خوب تُرن تراں ہوئی۔ نامور اہلِ قلم کمک پہ تھے۔ ہم نے اُس مواد کی بھی نشاندہی کر دی تاکہ کسی نتیجہ پر پہنچا جا سکے۔

تیسرا باب گو مختصر ہے مگر تحقیق کے میدان میں، ایسی موشگافیوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بے شک ذہنی زور آزمائی کا یہ باب کٹھن ہے۔ مگر جو باتیں غلط راہ پا جاتی ہیں ان کا ازالہ اسی طرح بحث و تمحیص ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

چوتھا باب شعر و ادب کے اُن دقیق پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے جن کا جاننا، ادب کے ہر طالب علم کے لیے لابدی ہے۔ زبان کی نزاکتیں کیا ہیں۔ باریکیاں کیا ہیں۔ اسے ہر کوئی کہاں جانتا ہے۔

پانچواں باب معرکہ آرائیوں کی روایت اور اسباب پر گفتگو کا ہے۔ اس باب کو ابتدا میں آنا چاہیے تھا۔ چونکہ یہ رسالہ پڑھے لکھے لوگوں کا ہے اور اہلِ علم کو رہنمائی کی کم، تائید کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے یہ جگہ بھی مناسب معلوم ہوئی۔

یہ باتیں تو ہوئیں۔ اس نمبر کے موضوع یا مندرجات کے بارے میں، کچھ مندرجات ایسے ہوتے ہیں جن کا احوال کاغذ پہ لکھا نہیں ہوتا۔ دل پہ لکھا ہوتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ کچھ ان مندرجات کا بھی ذکر ہو جائے۔ بتانا مقصود یہ ہے کہ اس نمبر کی تکمیل میں جناب کسری منہاس، جناب مختار حق، جناب ڈاکٹر وحید قریشی اور جناب ڈاکٹر محمد ذکریا نے بھی میری مدد کی ہے۔ یہ سب کے سب ہنگامہ پرور تو نہ تھے۔ ہنگامہ پسند ضرور نکلے۔

—— اور ہاں یہ نمبر نامور کارٹونسٹ جناب جاوید اقبال کے شاہکاروں سے بھی مزین ہے۔ جن کی داد زمانہ دیتا ہی رہے گا۔

(محمد نقوش)

اُردو کیوں اور کہاں پیدا ہوئی ؟

معرکہ آرا :

محمد حسین آزاد - حافظ محمود شیرانی - نصیر الدین ہاشمی
ڈاکٹر محی الدین زور - حکیم شمس اللہ قادری - عبدالقادر سروری

اُردو زبان کیوں اور کہاں پیدا ہوئی - اس معرکہ کا آغاز مولانا محمد حسین آزاد کے اس مشہور نظریہ سے ہوتا ہے "ہماری اُردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے"۔ یہ نظریہ آبِ حیات کی پہلی اشاعت سنہ ۱۸۸۰ء میں سامنے آیا - اس نظریہ پر مختلف ماہرین لسانیات نے بہت کچھ لکھا ہے اور اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے - کچھ آرا مخالف اور کچھ موافق موجود ہیں - البتہ اس امر میں سب کا اتفاق ہے کہ اُردو مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی اختلاط اور میل جول سے پیدا ہوئی - باہمی تبادلۂ خیالات کے مواقع پیدا کرنے کے لیے یہ زبان خودبخود وجود میں آ گئی - مسلمان فارسی ، عربی اور ترکی بولتے تھے اور ہندوستان کے مقامی باشندے اپنے اپنے علاقوں کی مختلف زبانیں - مسلمان فاتحین جہاں بھی گئے - اپنی زبان اپنے ساتھ لے گئے - میل جول ، لین دین کی یہی زبان ہندوستان کے مختلف صوبوں میں مختلف ناموں سے پکارے جانے لگی - "اُردو" ترکی زبان کا لفظ ہے جو لشکر یا فوج کے معنی میں استعمال ہوتا ہے - اُردو کو کتنے ناموں سے محققین نے اپنی اپنی تصانیف میں یاد کیا ہے - اس کا تذکرہ آئندہ صفحات میں موجود ہے -

محققین نے اُردو کو غلط فہمی کی بنا پر ہندی یا سندھی یا برج بھاشا یا کھڑی بولی کی بیٹی سمجھ کر لاطائل بحثوں کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا اور اپنے اپنے نظریہ کو ثابت کرنے کے لئے پوری پوری کوشش کی جس سے غلطیوں اور غلط فہمیوں میں اضافہ ہی ہوتا گیا - یہ غلط فہمیاں یورپ کے ماہرین لسانیات نے پیدا کی ہیں - جن پر ہمارے ملک کے محققین نے تحقیق و تدقیق کی ہے اور اس کے نتائج پر بھی کماحقہٗ روشنی ڈالی ہے - اُردو اور پنجابی کے اصل تعلق کو یورپ والے نہیں سمجھ سکے جسے پروفیسر شیرانی نے "پنجاب میں اُردو" میں تفصیل سے لکھا ہے - سندھ میں اُردو ، گجرات میں اُردو ، مدراس میں اردو ، دکن میں اُردو ، دلّی میں اُردو کے قابل احترام مصنفین نے اس معرکے میں حصّہ لیا ہے - چند دوسرے ناقدین بھی اس ضمن میں آ گئے ہیں انہوں نے بھی اپنا اپنا نقطۂ نگاہ پیش کیا ہے جس سے یہ مسئلہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے -

اردو زبان کی داغ بیل اور تعمیر اسی وقت سے شروع ہو گئی تھی جب سنہ ۱۰۲۷ء میں غزنوی فوجیں اپنے متوسلین کے ساتھ لاہور میں بس گئیں - اہل غزنہ کی حکومت ہندوستان میں کم و بیش ایک سو ستر سال رہی یہ قدرتی بات ہے کہ لین دین کی زبان کی بنیا پڑ چکی تھی قطب الدین ایبک نے سنہ ۵۸۹ھ (۱۱۹۳ء) میں دہلی اور میرٹھ کو فتح کیا اور وہی زبان ساتھ لے گئے جو پنجاب میں پیدا ہو چکی تھی لشکر میں چونکہ پنجابیوں کی تعداد زیادہ تھی اس لئے دہلی کے کوچہ و بازار اس زبان سے گونج اٹھے - گجرات میں اردو سنہ ۱۲۹۷ء میں علاؤالدین خلجی کے فتح گجرات کے بعد پہنچی دکن میں محمد تغلق نے سنہ ۱۳۲۶ء میں چڑھائی کی اور دولت آباد پایۂ تخت بنایا - گجرات اور دکن کی زبان ایک ہی ہے معمولی فرق کہیں کہیں مل جاتا ہے - ملک کافور نے سنہ ۷۱۰ھ (۱۳۱۰ء) میں مدراس پر حملہ کیا - دکن میں اُردو کی ابتدا علاؤالدین خلجی کی افواج نے کی - خلجی کے حملے سنہ ۱۲۹۶ء اور ۱۳۱۱ء

www.taemeernews.com

کے درمیان ہوئے۔

یہ معرکہ مختلف ناقدین اور مبصرین کی اپنی اپنی زبان میں ان کی تصانیف سے لیا گیا ہے تصانیف کے حوالے جا بجا دیئے گئے ہیں تاکہ مزید تحقیق کرنے والے اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

سندھ میں اُردو

"جس ملک میں ہم آپ آباد ہیں، یہاں ہمارے اسلاف جن اغراض اور اسباب سے بھی یہاں آئے۔ یہاں بہرحال اب ہمیں اسی دیس میں رہنا اور سرزمین میں جینا اور مرنا ہے۔ آیئے ہم آپ تھوڑی دیر کے لئے غور کریں کہ اس ملک کو ہمارے بزرگوں کی آمد سے کیا خیر و برکت نصیب ہوئی زبان کے لحاظ سے اس ملک میں بھانت بھانت کی بولیاں تھیں اور ہیں چنانچہ پیمائش لسانی کے محققین کے نزدیک اس میں آج بھی تین سو سے زیادہ بولیاں مروج ہیں۔ ان بولیوں کو چھوڑ کر یہاں صرف ممتاز زبانوں کو لیا جائے تو بھی تعداد دہائی سے کم نہ ہوگی۔

مسلمانوں نے جب اس ملک میں قدم رکھا اور بولیوں کی کثرت کے شاکی نظر آئے سنہ ۲۷۰ھ میں سندھ کی اسلامی حکومت پر پونے دو سو برس گزر چکے تھے۔ منصورہ (بھکر واقع سندھ) میں ایک ایسا عراقی مسلمان شاعر تھا جو ہندوستان کی مختلف زبانوں سے واقف[1] تھا اس نے الرا: الور سندھ کے راجہ کی فرمائش سے قرآن کا ترجمہ ہندی (شاید سندھ کی کسی زبان) میں کیا تھا[2] مسعودی جو ۳۰۳ھ میں ہندوستان آیا تھا۔ ہندوستان کی ملکی اور لسانی پریشان حالی کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے۔

بعد ازیں ہند کے لوگوں کے خیالات مختلف ہو گئے اور مختلف گروہ پیدا ہو گئے اور ہر رئیس نے اپنی ریاست الگ کر لی تو سندھ پر ایک راجہ بنا اور قنوج میں دوسرا اور کشمیر میں تیسرا اور مانکیر پر جو بڑا اعلاقہ ہے (گجرات کاٹھیاوار) بلہرا (دلبھ رائے) کی حکومت ہوئی۔۔۔۔ اور ان ریاستوں میں باہم اختلاف ہیں[3]، یہی مورخ آگے چل کر لکھتا ہے۔

"اور سندھ کی زبان ہندوستان کی زبان سے الگ ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور مانکیر (یعنی گجرات) کی زبان گیری ہے۔ اور اس کے ساحلی شہروں جیسے چیمور، سوبارہ اور تھانہ (بمبئی) کی زبان لاڑی ہے" ابن ندیم بغدادی نے الفہرست ۳۷۷ھ میں ترتیب دی ہے۔ سند و ہند کی نسبت لکھتا ہے۔

"یہ لوگ مختلف زبانوں اور مختلف مذہبوں والے ہیں اور ان کے لکھنے کے خط بھی کئی ہیں۔ ایک شخص نے جو اس ملک میں خوب گھوما پھرا تھا بتایا ہے کہ وہاں دو خط مستعمل ہیں[4]۔

۱؎ عجائب الہند بزرگ بن شہریار ص۳ پیرس

۲؎ مروج الذہب مسعودی جلد اول پیرس

۳؎ مروج الذہب مسعودی جلد اول ص۳۸۱ پیرس

۴؎ کتاب الفہرست مصر ص ۲۴

www.taemeernews.com

ابوریحان بیرونی نے جو سلطان محمود غزنوی کا معاصر تھا اور جو ہندوستان میں سالہا سال رہ کر یہاں کے علوم و فنون اور زبانوں کو سیکھتا تھا۔ ایک موقع پر ہندوستان کے رسم خطوں کے سلسلہ میں لکھتا ہے:

"ہندی خط بائیں طرف سے چلتا ہے۔ اس کے مشہور رسم خط کا نام سدھ ماترک ہے۔ کشمیر کی طرف عموماً منسوب ہے اور یہی بنارس میں جاری ہے اور یہی مدھ دیس یعنی صوبہ متوسط میں جو قنوج کے اطراف کا نام ہے جس کو آریاورت کہتے ہیں چلتا ہے۔ مالوہ کے حدود میں ایک خط جاری ہے جس کو ناگر کہتے ہیں اور اسی کے بعد ناگری خط ہے یعنی آدھا ناگر کیونکہ یہ ناگر اور دوسرے خطوں سے ملا جلا ہے اور یہ بھاتیہ اور کچھ سندھ میں مروج ہے اس کے بعد ملواری خط ہے جو ملوشا یعنی جنوبی سندھ میں رائج ہے اور کنٹری کرناٹک میں اور انتری (آندھری) انتر (آندھرا) میں اور دراوڑی دراوڑ دیش میں اور لاری لار دیش (گجرات کاٹھیاوار) اور گوڑی بنگال پورب دیش میں اور بیکشک اودپنور میں اور یہ بودھوں کا خط ہے۔" ص۲۸

یہ بات بالکل واضح ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے اس ملک میں بیسیوں[1] زبانیں مروج تھیں۔ ہندوستان کے ہر صوبہ میں الگ الگ بولی تھی۔ مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچتے ہیں اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم اردو کہتے ہیں اس کا "ہیولیٰ" اس وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔ عربی و فارسی بولنے والے مسلمان تاجر عراق، بندرابلہ، سیراف اور بصرہ سے نکل کر سندھ کے بندروں سے گزر کر گجرات ہو کر بحر ہند کے کنارے کنارے سفر کرتے تھے۔ آخر پہلی صدی کے آخر یعنی ساتویں صدی عیسوی میں عرب مسلمانوں نے سندھ پر قبضہ کر لیا۔ یہ اسلامی لشکر شیراز اور عراق سے مرتب ہو کر آیا تھا۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اس لشکر کے لوگ فارسی اور عربی بولتے تھے۔ اس کے بعد جو سوداگر اور تاجر یہاں آکر بودوباش اختیار کرنے لگے تھے۔ وہ بھی عربی و فارسی بولتے تھے۔ جہازرانوں کی زبان بھی عربی و فارسی سے مرکب تھی۔ خود سندھیوں کی آمد و رفت بھی عراق میں لگی رہتی تھی۔ خصوصاً ۱۳۲ھ میں خلافت کا مرکز شام سے عراق منتقل ہو گیا اور سندھ کے پنڈتوں نے بغداد جا کر اپنی زبان سے عربی میں کتابوں کے ترجموں میں مدد دینے اور وہاں کے مختلف علمی و طبی منصبوں پر سرفراز ہونے لگے۔ اس زمانہ میں عربی میں ہندی کے بہت سے اصطلاحی لفظ اور دواؤں اور خوشبوؤں کے نام داخل ہوئے مثلاً بیڑہ جس کی عربی شکل بارجہ۔ پلنگ جس کی عربی صورت بلنجہ ہے۔ جہاز کی خوابگاہ کے معنوں میں عرب ملاحوں نے اس کو استعمال کیا ہے۔ اسی طرح خوشبوؤں میں صندل (چندن) کافور (کپور) قرنفل (کرن پھول) وغیرہ لفظ ہیں۔ دواؤں میں سب سے عجیب مجھے "بہط" معلوم ہوتا ہے جس کو خوارزمی نے جو سلطان محمود کا معاصر تھا مفاتیح العلوم میں نقل کیا ہے۔ جو ہمارے ہاں "بھات" کی خرابی ہے۔ پھلوں میں امبج (انب) آم اور لیموں ہیں۔

---

[1] مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی تصنیف نقوش سلیمانی میں ان تمام زبانوں کا ذکر کیا ہے جو مسلمانوں کے آنے سے پہلے ہندوستان میں رائج تھیں امیر خسرو نے نہ سپہر میں اور ابو الفضل نے آئین اکبری میں ان زبانوں کے نام اور ان پر مسلمانوں کے اثرات گنائے ہیں جو اس زمانے میں رائج تھیں۔ (نقوش سلیمانی طبع معارف پریس اعظم گڈھ ص۲۱-۳۰)

www.taemeernews.com

عربی و فارسی کا میل جول ہندوستان کے جس حصہ میں پہلے واقع ہوا وہ سندھ ہے۔ جس کی حد اس زمانے میں ملتان سے لے کر بھکر اور ٹھٹھہ کے سواحل تک پھیلی تھی۔ اس زمانہ میں ایران، ترکستان اور خراسان سے ہندوستان آنے کا راستہ براہِ راست ملتان ہو کر تھا۔ چنانچہ محمود غزنوی بھی اسی راستے سے ہندوستان آیا۔ اس کا اثر یہ تھا کہ ان ملکوں سے علم و فن کے کامل اور شعر و ادب کے ماہر اسی راستہ سے آ کر ہندوستان کے جس پہلے شہر میں داخل ہوتے تھے وہ ملتان تھا۔ چنانچہ سلطان ناصر الدین قباچہ کے زمانہ تک جو التمش کا معاصر و حریف تھا۔ ملتان ہی اسلامی علوم و فنون کا مرکز اور اسلامی تعلیم کی درس گاہ تھا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ مرکزِ ثقل ملتان سے لاہور اور پھر لاہور سے دہلی کو منتقل ہو گیا۔

اس تشریح سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کی عربی و فارسی سب سے پہلے ہندوستان کی جس دیسی زبان سے مخلوط ہوئی وہ سندھی اور ملتانی ہے۔ پھر پنجابی اور بعد ازیں دہلوی۔ سندھی پر اس اختلاط کی شہادت آج بھی اسی طرح نمایاں ہے چنانچہ ہماری اُردو کی طرح سندھی بھی عربی و فارسی الفاظ سے اسی طرح گرانبار ہے اور سب سے عجیب یہ کہ اس کا رسم الخط آج تک ٹھیٹھ عربی نسخ ہے اور عربی کے بہت سے خالص الفاظ مستعمل ہیں۔ مثلاً پہاڑ کو جبل اور پیاز کو بصل کہتے ہیں۔

سندھی ملتانی اور پنجابی آپس میں بالکل ملتی ہیں۔ تینوں میں بہت سے الفاظ کا اشتراک ہے۔ تینوں میں عربی و فارسی لفظوں کا میل ہے۔ صیغوں کے طریق میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے۔ یہاں پر اس تاریخی غلط فہمی کا مٹانا ضروری ہے جس کے رو سے عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بولیاں موجودہ اردو کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ اردو ان ہی بولیوں کی ترقی یافتہ اور اصلاح شدہ شکل ہے۔ یعنی جس کو ہم اُردو کہتے ہیں اس کا آغاز ان ہی بولیوں میں عربی و فارسی کے میل سے ہوا اور آگے چل کر دار السلطنت دہلی کی بولی سے جس کو دہلوی کہتے ہیں مل کر معیاری زبان بن گئی اور پھر دار السلطنت کی بولی معیاری زبان بن کر تمام صوبوں میں پھیل گئی۔ علامہ بیرونی المتوفی سنہ ۴۴۰ھ جس نے ہندوستان میں شاید ملتان اور سندھ میں رہ کر کتاب الہند کا مسالہ مہیا کیا ہے۔ اس نے اپنی کتاب میں جس لہجہ اور طرزِ ادا میں ہندی الفاظ لکھے ہیں ان سے ماہرینِ ادب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ ملتانی اور سندھی شکل میں ہیں۔

جب غزنین میں آلِ سبکتگین کی حکومت قائم ہوئی اور سبکتگین اور اس کا نامور فرزند ہندوستان پر پے در پے حملے کرتے رہے تو ان حملہ آوروں کی مادری زبان ترکی، مگر علمی و ادبی زبان فارسی تھی۔ سلطان محمود غزنوی المتوفی سنہ ۴۲۱ھ نے گجرات تک دھاوا کیا مگر اس کی سلطنت بالآخر پنجاب و سندھ میں سمٹ کر رہ گئی۔ جہاں تقریباً دو سو برس تک وہ قائم رہی اس میل جول کا اثر یہ ہوا کہ ترکستان، ایران اور کابل کے ہزاروں لاکھوں آدمی ہندوستان آ کر بس گئے اور ہزاروں ہندوستانی ان ملکوں میں جا پہنچے اور ہندی غلاموں اور کنیزوں کی گھر گھر فراوانی ہوئی[1]۔ غزنویوں کی فوج میں بہت سے ہندو افسر اور سپاہی نوکر تھے اور حدودِ سلطنت میں موقع بموقع بھیجے جاتے تھے۔

---

[1] علاوہ تاریخوں کے دیکھو قابوس نامہ بندہ خریدن"

www.taemeernews.com

سلطان محمود کے دربار میں ہندی مترجم تلک نام ایک ہندو تھا جس کی تعلیم و تربیت کشمیر میں اور اصفہان جا کر اس نے فارسی سیکھی تھی۔ سلطان مسعود کے زمانہ میں ۴۲۱ھ میں تخت پر بیٹھا تھا۔ اس عہدہ پر ایک ہندو بیربل نام سرفراز تھا۔ سلطان محمود کے دربار میں جہاں عرب و عجم کے ادبا رہتے تھے۔ فضلائے ہند بھی ان کے پہلو بہ پہلو تھے کالنجر کے راجہ انند نے ۴۱۳ھ میں ہندی میں بادشاہ کے لیے مدحیہ شعر لکھے۔

"انند بزبان ہندی در مدح سلطان شعرے گفتہ۔ نزد او فرستادہ سلطان آں را بفضلائے ہند و عرب و عجم کہ در ملازمت او بودند نمودہ ہمگی تحسین و آفریں کردند" (فرشتہ)

اس اختلاط اور میل جول کا قدرتی اثر یہ ہوا کہ اہلِ ولایت کی زبانوں پر ہندی الفاظ اور ہندوؤں کی زبانوں پر فارسی الفاظ چڑھ جائیں۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ غزنوی عہد کے بعض ان شعرا کی زبانوں سے بھی ہندی الفاظ ادا ہوئے ہیں جنہوں نے ہندوستان کا منہ تک بھی نہ دیکھا تھا۔ حکیم سنائی غزنوی (۴۶۴ھ ۔ ۵۴۵ھ) جو بہرام شاہ غزنوی کے معاصر تھے۔ وہ اپنے ایک قصیدہ میں زبانوں کے اختلاف کو غیر اہم بتا کر فرماتے ہیں۔

تو بے مرگ ہرگز بجائے نیابی ٭ زشکِ نقشہائے اینی و آنی
اسامی دریں عالم است ارنہ حاشا ٭ چہ آب و چہ نان و چہ میدہ چہ پانی[1]

عہدِ غزنوی کا مشہور شاعر مسعود سعد سلمان جو خاص لاہور میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی نسبت عوفی اور امیر خسرو نے لکھا ہے وہ عربی فارسی کے علاوہ ہندی کا بھی شاعر تھا اور اس زبان میں اپنا ایک دیوان بھی یادگار چھوڑا۔ اس کے دیوان میں ایک شعر کا دوسرا مصرع ہے[2]

برآمد از پسِ دیوارِ حصن مارا مار

ان شعروں میں پانی اور مارا مار اور شاید میدہ[3] ہندی لفظ ہیں۔ جو اہلِ ولایت کی زبانوں پر چڑھ گئے تھے۔ اب ساتویں صدی ہجری کے آغاز میں غوریوں کا دَور شروع ہوا۔ جنہوں نے بہت جلد لاہور اور ملتان سے آگے بڑھ کر اصل ہندوستان پر قبضہ کیا اور دہلی کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ اب اس مشترکہ زبان کا قدم اور آگے بڑھا ان کی حکومت پشاور سے گجرات اور بنگال تک قائم ہو گئی۔ اس پورے ملک میں جہاں کہیں کبھی بول چال کی ایک زبان نہ تھی۔ ایک مشترک زبانِ ہند کا ہیولیٰ تیار ہو گیا۔ قاضی سراج منہاج جو ۶۲۴ھ میں سندھ اور ملتان کی راہ سے ہندوستان آئے تھے۔ اپنی تاریخ کوچ بہار اور اس کے قرب جوار کے فتوحات کا سلسلہ لکھتے ہیں۔

"وایں را زبانِ دیگر است میانِ ہند و تبت" صفحہ ۱۵۲ کلکتہ

---

[1] کلیات سنائی بمبئی ص ۹۶۔

[2] پنجاب میں اردو۔

[3] لفظ میدہ فارسی لغات میں گو ملتا ہے (مؤید الفضلا) مگر خیال ہوتا ہے کہ یہ ہندی ہے کیونکہ یہاں شاعر نے آب و پانی کو جس طرح بالمقابل استعمال کیا ہے ویسے نان اور میدہ کو بالمقابل شاید رکھا ہے۔ بطور لف و نشر غیر مرتب۔

www.taemeernews.com

اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کی ایک زبان پنجاب سے لے کر بنگال تک پیدا ہو چکی تھی۔ جس کے برخلاف وہاں کی زبان ہندوستانی زبان اور تبت کی زبان بیچ میں تھی۔

دہلی کے سب سے پہلے سلطان قطب الدین ایبک کو رعایا نے اس کے جود و کرم کے صلہ میں "لک بخش" کا خطاب دیا تھا۔ (فرشتہ جلد اول صفحہ ۶۳) یعنی لاکھوں کے دینے والا۔ اس کے زمانہ کی تعریف میں اہل ہند "کال قطب الدین" کہتے ہیں" وکال زمانہ را گویند" (فرشتہ جلد اول ص۶۳ نولکشور) اس عہد کے سکوں پر بادشاہ کے نام کے ساتھ (سری امیر) لکھا ملتا ہے۔ سری کا لفظ آج بھی ہندوؤں میں سری مہراج کی ترکیب میں مستعمل ہے۔ مگر اس وقت کی اس ترکیب "سری امیر" پر ذرا غور کیجئے:

شمس الدین التمش نے اپنے خواجہ تاش، لیکن حریف ناصر الدین قباچہ کو ۶۱۵ھ میں شکست دے کر ملتان اور سندھ کو بھی دہلی سے ملا لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان اطراف کے بہت سے تاجر اور سوداگر دہلی آ گئے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ "ملتانیاں" کا لفظ اسی زمانہ میں سوداگران پارچہ کے ہم معنی ہو گیا تھا[1]۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اب ملتان اور لاہور اور دہلی کی مشترکہ خدمات اس متحدہ زبان کے بنانے میں شامل ہو گئی تھیں۔ اس کی سند میں ایک ایسی بزرگ ہستی کا نام لینا ہے۔ جن کی پیدائش اور تعلیم و تربیت ملتان اور سندھ میں ہوئی مگر روحانی اکتساب فیض دہلی میں فرمایا اور آخری سکونت اور دائمی آسودگی لاہور کی مملکت میں اختیار فرمائی یعنی حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ"[2]

اردو سندھی کے لسانی روابط میں شرف الدین اصلاحی اس موضوع پر رقم طراز ہیں۔

"اردو کے تولد یا ارتقا کے ذکر میں یہ بات بالعموم کہی جاتی ہے کہ وہ دو تہذیبوں کے اختلاط اور دو قوموں کے میل جول کا نتیجہ ہے۔ یعنی یہ کہ مسلمان جب فاتح کی حیثیت سے ہندوستان میں آ کر آباد ہو گئے اور ان کا ربط ضبط یہاں کے مقامی لوگوں سے ہوا۔ تو فاتح اور مفتوح کی زبانوں نے مل کر ایک نئی زبان کا روپ دھارا اور اس طرح ہماری اردو وجود میں آئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اردو اپنے انفرادی وجود اور امتیازی خال و خط کے لئے سرتاپا عربی فارسی عناصر اور اسلامی اثرات کی رہین منت ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کی کوئی اصل و بنیاد نہیں اور بقول شخصے اس نے کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا جمع کر کے بھان متی کا کنبہ جوڑا ہے[3]۔ اردو کا تعلق اس زبان سے ہے جو آریہ قبائل اپنے ساتھ لائے۔ اسی اصل سے ہزاروں سال ارتقا کے بعد اردو معرض وجود میں آئی۔

اردو کے مخلوط زبان ہونے کا خیال صرف اس حد تک درست ہے کہ اس نے مختلف زبانوں سے اپنے الفاظ کا خزانہ بھرا ہے۔ ورنہ جہاں تک اس کے بنیادی ڈھانچے کا تعلق ہے دوسری ہند آریائی زبانوں کی طرح وہ بھی باقاعدہ اپنا شجرۂ نسب رکھتی ہے اور قدیم ہند

---

[1] تاریخ فیروز شاہی۔

[2] اقتباسات از نقوش سلیمانی از سید سلیمان ندوی طبع معارف پریس اعظم گڑھ ص۳۸-۳۷

[3] مزے کی یہ بات ہے کہ اردو کی طرح سندھی کے متعلق بھی یہ خیال پایا جاتا ہے کہ وہ ایک مخلوط اور مرکب زبان ہے آفتاب ادب کے مصنف حکیم فتح محمد سیوہانی لکھتے ہیں "یہ حقیقت ہے کہ موجودہ سندھی سنسکرت، عربی، فارسی، ترکی اور کسی قدر انگریزی کی ترکیب ہی سے تیار ہوئی ہے" صفحہ ۴۶ ترجمہ۔

آریائی کے ساتھ اس کا بھی وہی تعلق ہے۔ جو اس کی ہم عصر بولیوں کا ہے۔ اردو کے مخلوط زبان ہونے کا یہی غلط تصور تھا۔ جو بعض اہلِ علم کے اس لسانی مغالطے کا سبب بنا کہ اُردو کا مولد سندھ ہے۔

یہ نظریہ سب سے پہلے مولانا سید سلیمان ندوی نے پیش کیا۔[1] اس کی تغلیط خود سید صاحب کے اپنے ایک مضمون سے ہوتی ہے معارف جولائی ۱۹۳۳ء میں "اُردو کیوں کر پیدا ہوئی" کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

موجودہ معیاری اردو دہلوی زبان، دوسری زبانوں سے مل کر بنی ہے۔ آج کل بعض فاضلوں نے "پنجاب میں اردو" اور بعض اہلِ دکن نے "دکن میں اردو" اور بعض عزیزوں نے "گجرات میں اُردو" کا نعرہ بلند کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر ممتاز صوبے کی مقامی بولی میں مسلمانوں کی آمد و رفت اور میل جول سے جو تغیرات ہوئے ان سب کا نام "اردو" رکھ دیا گیا حالانکہ ان کا نام پنجابی۔ دکنی۔ گجراتی یا گجری وغیرہ رکھنا چاہیے۔ جیسا کہ اس عہد کے لوگوں نے کیا ہے۔ یہ تغیرات جب ممتاز صوبوں میں ہو رہے تھے۔ تو خود پایۂ تخت دہلی میں تو اور زیادہ ہوتے۔

سید صاحب نے اپنے مضمون میں اردو کی پیدائش کے متعلق نعرہ بلند کرنے والے مختلف مکاتب خیال کا ذکر فرمایا ہے۔ مگر اس نعرے کو نظر انداز کر دیا ہے جو انہوں نے خود بلند کیا یعنی "سندھ میں اُردو" کا نعرہ جس طرح پنجاب، دکن، گجرات میں ہندو مسلم اختلاط یا مقامی بولی کے ساتھ عربی فارسی کے میل سے جو زبانیں وجود میں آئیں۔ اُردو نہیں بلکہ پنجابی۔ دکنی۔ گجراتی یا گجری تھیں۔ اسی طرح سندھ میں جس زبان کا ہیولیٰ تیار ہوا وہ اُردو نہیں سندھی تھی۔ ڈاکٹر زور اس نظریے کی بحث فرماتے ہیں۔

بہرکیف یہ نظریہ کہ اُردو کا مولد سر زمین سندھ ہے۔ اگرچہ علم و تحقیق کی کسوٹی پر پورا نہ اترے لیکن اتنی بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جن عوامل نے ہندوستان کی ایک آریائی زبان کو ہماری اردو کا قالب عطا کیا۔ وہ سب سے پہلے سندھ میں کار فرما ہوئے جس کا نتیجہ موجودہ سندھی زبان ہے۔ سندھی اور اردو کے اشتراک و تشابہ کا ایک پہلو ہے جو صرف انہی عوامل کا مرہونِ منت ہے۔ ہماری مراد عربی فارسی اثرات سے ہے جو انہوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد قبول کی۔

یہ کتنی عجیب دل خوش کن بات ہے کہ سندھ میں اُردو شاعری کا سراغ اُس زمانے سے ملتا ہے جو کہ اس کا قدیم ترین عہد کہا جاتا ہے یعنی "دکنی دور" اور جبکہ شمالی ہند میں اُردو ادبیات کی ہنوز ابتدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ جدید تحقیقات کی رُو سے اُردو کا سب سے پہلا صاحبِ دیوان شاعر سلطان قلی قطب شاہ ہے جس کا زمانۂ حکومت ۹۸۸ھ ۱۰۲۰ھ ہے جس زمانے میں قلی قطب شاہ دکن میں اُردو شاعری کا بول بالا کر رہے تھے۔ تقریباً اسی زمانے میں بکھر (سندھ) میں فاضل بکھری اُردو شاعری کا چراغ روشن کر رہے تھے۔ میر فاضل "تاریخ معصومی" کے مصنف میر معصوم بکھری کے چھوٹے بھائی ہیں۔ اور ان کے اُردو کلام کی شہادت "ذخیرۃ الخوانین" سے ملتی ہے۔ ذخیرۃ الخوانین کے مصنف کا بیان ہے "شعر بزبانِ ہندی از قسم کانی بکمال فصاحت می گفت و قبولیت داشتہ" فاضل بکھری کا سنہ ولادت یا سنہ وفات دستیاب نہیں ہو سکا اندازاً وہ دسویں صدی ہجری میں گزرے ہیں اس لیے کہ ان کے بھائی معصوم بکھری کی وفات ۱۰۱۵ ہجری میں ہوئی

---

[1] نقوش سلیمانی صفحہ ۳۱، ۷۸۔

[2] اُردو سندھی کے لسانی روابط ص ۳۵ - ۴۰ طبع مرکزی اردو بورڈ۔ لاہور۔

www.taemeernews.com

یہ کوئی واحد مثال نہیں۔ ایسے سندھی شاعروں کا پورا ایک سلسلہ عہد بہ عہد ہے۔جنہوں نے اُردو میں طبع آزمائی کی ہے۔اگر کاوش کی جائے اور تلاش و تحقیق میں ہمت سے کام لیا جائے۔ تو دکن اور شمالی ہند کے دوش بدوش تقریباً ہر دَور میں اُردو کے سندھی شاعر ملیں گے[1]

" سندھ کے شہروں میں ذاتی کتب خانوں کا رواج عام ہے۔ یہاں کے خاندان رؤسا کے کتب خانے دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پیر سید حسام الدین راشدی۔ پیر پگارو۔ پیر سرہندی، مخدوم ہالائی اور تالپور خاندان کے کتب خانے اپنے قدیم سرمائے اور نوادرات کے اعتبار سے علم و ادب کے انمول خزانے ہیں۔ ان کتب خانوں میں عربی، فارسی اور سندھی کے دوش بدوش اردو کتابوں کی تعداد بھی کثرت سے نظر آتی ہیں۔ اس سے جہاں شرفائے سندھ کی علم دوستی اور ادب پروری کا ثبوت ملتا ہے۔ ان کی اُردو نوازی بھی آشکار ہوتی ہے۔ ان کتب خانوں میں اُردو کے بعض ایسے نادر و نایاب شہ پارے موجود ہیں جو آجکل کی بڑی بڑی لائبریریوں میں بھی نہیں پائے جاتے"[2]

اُردو اور سندھی کے مشترک مت ادر حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ اُردو سندھی کے لسانی روابط میں صفحہ ۲۰۰ سے صفحہ ۴۰۴ تک چھپے ہوئے ہیں۔ جن سے دونوں زبانوں کے اشتراک پر روشنی پڑتی ہے :

" اردو زبان کی پیدائش کے متعلق اردو ادب کے مؤرخین تین گروہ میں منقسم ہیں۔ ان میں ہر ایک کا نظریہ اُردو زبان کی پیدائش کے متعلق علیحدہ ہے پہلے گروہ کی ترجمانی مولانا محمد حسین آزاد فرماتے ہیں۔ دوسرا نظریہ قائم کرنے والے پروفیسر نصیر الدین ہاشمی ہیں ان کا کہنا ہے کہ اردو نے پہلے پہل جنوبی ہندوستان میں جنم لیا اور تیسرے خیال کو حافظ محمود خان شیرانی مرحوم نے ادبی دنیا سے روشناس کرایا اور پنجاب میں اُردو کی ابتدائی نشوونما کا حال بیان کیا۔ چوتھا نظریہ بھی ہے کہ اُردو زبان نے سب سے پہلے سندھ میں جنم لیا ہے۔ اس صوبے کو جہاں باب الاسلام ہونے کا شرف حاصل ہے وہاں اسے اُردو زبان کو ہندوستان سے روشناس کرنے کی بھی عزت حاصل ہے۔ کیونکہ یہ وہ حصّہ ہے جہاں سب سے پہلے عربی اور فارسی زبانیں آئیں اور مقامی زبان سے اختلاط پر ایک نئی زبان پیدا ہوئی۔ جسے اُردو کہتے ہیں۔ ۳۹۲ھ سے قبل صوبہ سندھ کی حدود تقریباً موجودہ مغربی پاکستان کی حدود پر مشتمل تھیں۔ اس وقت سندھ نہایت زرخیز اور تجارتی ملک تھا۔ اس لئے تجارتی تعلقات چین۔ چینی ترکستان، ایران، افغانستان اور عراق سے تھے جس کی تصدیق مولانا سید سلیمان ندوی کے مقالہ" اُردو کیوں کر پیدا ہوئی" سے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ چوتھی صدی ہجری کے آخر تک منصورہ اور ملتان میں عربی اور سندھی بولی جاتی تھی۔ جب عربی، فارسی اور سندھی بولی جاتی تھی۔ تو یقیناً مخلوط الفاظ اور جملے بھی بولے جاتے ہوں گے اور وہی مخلوط الفاظ یا جملے موجودہ اُردو کی ابتدائی شکل ہوگی۔ عربی فارسی اور سندھی بولے جانے کا پتہ ہم کو حسب ذیل سیاحوں کے سفرناموں سے ملتا ہے

اصطخری : منصورہ (ضلع نواب شاہ) اور ملتان اور اُن کے اطراف کی زبان عربی اور سندھی ہے۔ اور مکران والوں کی زبان فارسی اور مکرانی ہے (صفحہ ۷۷، طبع لائیڈن)

---

[1] اردو سندھی کے لسانی روابط صہ۸۸-۸۹

[2] اردو سندھی کے لسانی روابط صہ۹۶۔

www.taemeernews.com

ابن حوقل: منصورہ اور ملتان اور اس کے اطراف میں عربی اور سندھی بولی جاتی ہے۔
(سفر نامہ ابن حوقل صـ۲۳۲ لائیڈن)

اس کے چند سال بعد ۳۷۵ھ (۹۸۵ء) میں بشاری مقدسی ملتان آیا۔ وہ لکھتا ہے" اور یہاں فارسی زبان بھی جاتی ہے"۔
(سفر نامہ بشاری صفحہ ۴۸۱ لائیڈن)

مندرجہ بالا بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عربی فارسی اور یہاں کی مقامی بولی نے آگے چل کر اردو زبان کی دایہ گیری کی خدمت انجام دی۔ عربوں کی قوت کو جب سندھ میں زوال آیا ——————————— تو سندھ پر سلاطین غزنویہ اور غوریوں کا تسلط ہوا۔ اسی طرح پر مغلوں کا بھی قبضہ عرصہ دراز تک رہا۔ لیکن جب مغلوں کے اقتدار میں کمزوری ہوتی تھی۔ تو سندھ کے رئیس خود مختار ہو جاتے تھے مسلمانوں کی حکومت سے پیشتر ہی سندھ میں مسلمانوں کی آمد و رفت تجارت کی وجہ سے بہت بڑھ چکی تھی لیکن قیام حکومت کے بعد عراق اور عرب سے ہزاروں خاندان "کرد دیبل" سے لے کر "ملتان" تک آباد ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ افغانستان اور دیگر ممالک سے مختلف زبانوں کے بولنے والے سندھ میں آئے، جو فارسی یا ترکی بولتے تھے، مگر درباری زبان فارسی ہی تھی۔ سندھ میں کئی صدیوں کی بود و باش نے سندھ کی زبان میں ہزاروں الفاظ فارسی اور عربی کے شامل ہو گئے۔ انھیں شمالی ہند کی بولیوں کا نام "اُردو" ہے۔

جب ہندوستان پر مغلوں کا مکمل قبضہ ہو گیا اور فارسی زبان کا دور دورہ ہوا۔ تو اس زمانے میں سندھ کے کئی شہر اسلامی علوم و فنون اور صنعت و تجارت کے مرکز تھے اور مغربی ممالک سے دہلی جانے کے لئے سندھ کے مشہور شہروں ہی سے گزرنا ہوتا تھا۔ ان میں ملتان۔ بھکر۔ ٹھٹھہ اور اچھ زیادہ مشہور ہیں۔ اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ مخدوم جلال الدین جہانیاں جہاں گشتؒ کے دادا ساتویں صدی ہجری میں بخارا سے پہلے بھکر آئے۔ پھر اچھ میں سکونت اختیار کی۔ حضرت جلال الدینؒ سے سلطان فیروز شاہ تغلق کو بڑی ارادت تھی اور حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ کئی مرتبہ اس بادشاہ کی درخواست پر دہلی تشریف لے گئے تھے۔ ہمارے لیے یہ اہم معلومات "جمات شاہی" (ملفوظات حضرت شاہ عالمؒ) میں محفوظ ہیں کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی راجو قتالؒ کے حق میں یہ حکم فرماتے ہیں کہ "انسان ہو جے۔ تساں رلجے" خود حضرت قتال نے فیروز شاہ تغلق کو اُردو زبان میں خطاب کیا ہے اور یوں مزاج پُرسی کی" کا کا فیروز چنگا ہے "۔

پروفیسر نصیر الدین ہاشمی اور دوسرے فضلاء کے نظریات کی اہمیت کم ہو جاتی ہے جب کہ سندھ میں ۷۵۱ھ کے بعد سے برابر اردو کے نمونے ملتے ہیں گویا سندھ میں اُردو زبان تقریباً چھ سو سال سے رائج ہے۔ سید سلیمان ندوی اس نظریہ کی ان الفاظ میں تائید کرتے ہیں" ہندوستان کی موجودہ بولی پیدا تو سندھ اور پنجاب میں ہوئی نشو و نما دکن میں پایا تعلیم و تربیت دلی میں حاصل کی لیکن تہذیب اور سلیقہ لکھنؤ میں سیکھا[۱]"

جہاں تک تحقیق کی گئی ہے۔ قدیم اُردو میں باقاعدہ شاعری کا آغاز قطب شاہی دربار میں ہوا اور محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ تا ۱۰۲۰ھ) پہلا شاعر تھا۔ جس کا کلام مختلف اصناف سخن میں دکنی اردو میں شائع ہوا۔ مگر ٹھیک اسی زمانے میں سندھ کے اندر بھی ایک بہت مقبول عام اُردو شاعر کا سراغ ملتا ہے۔ اس شاعر کا نام میر محمد فاضل بکھری تھا۔ تاریخ معصومی کے مصنف میر معصوم بکھری کا چھوٹا بھائی تھا[۲]"

---

[۱] نقوش سلیمانی صـ۳۰، طبع کلیم پریس کراچی۔ [۲] مقدمہ سندھ کے جدید اُردو شعراء صـ۱۳-۱۴۔

www.taemeernews.com

سندھ میں اُردو شاعری کے پانچ ادوار قائم کیے جا سکتے ہیں:

پہلا دور ۱۷۰۰ء / ۱۱۱۲ھ سے کر ۱۷۸۲ء / ۱۱۹۶ھ تک اس زمانے میں سندھ پر "کلہوڑا"[1] خاندان حکمران تھا۔ جن کی زبان سندھی کی سرائیکی زبان تھی۔ جس کا لب و لہجہ اور الفاظ اردو سے ملتے جلتے ہیں۔ فارسی درباری زبان ہونے کی وجہ سے بہت مقبول تھی۔ اور سیکڑوں شاعر موجود تھے۔ یہی نہیں بلکہ اس دور میں ایران سے بڑے بڑے شعرا مثلاً "مرزا صائب اور شیخ علی حزیں وغیرہ سندھ آئے اور ایک مدت تک علمی مجلسوں میں شرکت کرتے رہے ہندوستان سے بھی اس دور میں بلگرامی سادات وقائع نویسی کے سلسلہ میں سندھ تشریف لائے۔ جو اپنے زمانے کے بڑے عالم اور فارسی شاعری میں یگانہ روزگار تھے۔ بلگرام کے میر عبدالجلیل اور غلام علی آزاد کے بھی اردو شعر ملتے ہیں۔ یہ دور مغلیہ سلطنت کے انحطاط کا دور تھا۔ جو دہلی سے سندھ میں گزرتے رہتے تھے بعض اردو شعرا بھی تھے۔ مثلاً سید محمود صابر رضوی استرآبادی جو دہلی میں پیدا ہوئے اور ٹھٹھہ میں مستقل سکونت اختیار کی اور وہیں انتقال کیا "مقالات الشعرا" میں لکھا ہے۔

بزبان ہندی و فارسی دیوانہا متعدد در مرثیہ و بعضے در غزلیات و مناقب درست کردہ"

"شعرا کی آمد و رفت سے سندھ کے شعرا کو بھی اُردو میں شاعری کا شوق پیدا ہوا ہوگا اور فارسی شاعری کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی شاعری کی ہوگی۔ وہ سندھی نژاد اردو شاعر جو اس دور میں ملتے ہیں۔ مقالات الشعرا میں ان کی تعداد پچاس کے قریب ہے۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:

شیخ درد یا درد۔ عبدالسبحان فائز ٹھٹھوی۔ سید حیدر الدین کامل۔ مخدوم محمد معین بیراگی میر حفیظ الدین علی۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی:

شیخ درد کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو اور صرف یہی ایک شعر مقالات الشعرا میں ہے ؂

الا یا ایہا المفتی شدہ ریشِ تو جنگلہا
اکھاڑوں بال یک یک کر بناؤں خوب کمبلہا

مصرع ثانی دیکھیے وہی زبان ہے جو آجکل ہم بولتے ہیں:

سید حیدر الدین کامل (المتوفی ۱۷۵۰ء / ۱۱۶۴ھ

یہ فارسی سندھی اور ہندی تینوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو ؂

لب دلبر نے میرے قتل کا بیڑا اٹھایا ہے
خدایا خوف سوں میرے تو اس کوں سرخرو کرنا

بیاک ناموس کا ہے سینہ میں
نام کا زخم ہے نگینہ میں

خال رخسار کا اچنبا ہے
گال کے کھیت میں اُگا ہے تل

---

[1] مقدمہ سندھ کے جدید اُردو شعرا ص ۱۳-۱۴ -

www.taemeernews.com

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ سندھ کے مشہور سندھی شاعر کا نمونۂ کلام:۔

بلبل روئے رین دن کہاں گئی گلزار

ان کی قیامت آج ہے جن کے بچھڑے یار

لا الٰہ کر آرسی الا اللہ سے دیکھ

محمد صورت رب کی اس میں نہ میکھ[1] "

" اہلِ تحقیق کی رائے ہے کہ ملتانی اور سندھی ایک دوسرے سے الگ ہونے سے پہلے ایک تھیں۔ اور آج بھی سندھی بولنے والے کے لئے سرائیکی اور سرائیکی بولنے والے کے لئے سندھی زبان اجنبی نہیں ہے۔ جس طرح ملتانی و پنجابی سے اردو کا گہرا رشتہ و تعلق ہے۔ اسی طرح سندھی سے بھی اردو کا ویسا ہی بنیادی و قدیم رشتہ ہے جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں اردو زبان اُس علاقے میں تیزی سے پروان چڑھی جہاں مختلف اقوام کو سیاسی اور معاشرتی سطح پر ایک دوسرے سے ملنے جلنے کی ضرورت پیش آئی۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کی آمد سب سے پہلے سندھ میں ہوئی۔ عربوں کی حکومت سندھ و ملتان پر ۷۱۲ء سے ۱۰۲۶ء تک قائم رہی۔ انہوں نے اپنے نظامِ خیال کی قوت سے ان علاقوں میں وحدت کا تصور پیدا کر کے معاشرتی زندگی کی رفتار کو نہ صرف تیز کر دیا بلکہ تہذیبی و لسانی عوامل میں بھی ایک نئی روح پھونک دی۔ اس نئی سیاسی و معاشرتی صورتِ حال نے لسانی سطح پر ایک ایسی زبان کی ضرورت کو ابھارا جس کے ذریعے اس علاقے میں رہنے اور بسنے والی مختلف اقوام ایک دوسرے سے ابلاغ کر سکیں۔ سندھ جس اسلامی لشکر نے فتح کیا۔ اس میں فارسی اور عربی بولنے والے لوگ شامل تھے۔ وہ عمل جو عربوں کی فتح نے سرزمینِ ایران میں کیا وہی عمل سندھ میں کیا۔ یہ سیاسی تقاضا بھی تھا اور وقت کی اہم ضرورت بھی۔ جب مسلمان سندھ اور پنجاب پر قابض ہو گئے۔ تو یہاں بھی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔

" یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ مسلمان سب سے پہلے سندھ میں آئے۔ اور یہیں ان کی زبان عربی اور پھر فارسی کا ہندی زبانوں سے ارتباط و اختلاط شروع ہوا۔ لہٰذا یہ ایک واضح اور یقینی امر ہے کہ اردو کا اصلی مولد سندھ ہے (پیر سید حسام الدین راشدی۔ رسالہ اردو کراچی اپریل ۱۹۵۱ء)

غرض کہ یہ زبان اپنی ابتدائی شکل میں سندھ و ملتان کے علاقے میں عربوں کے زیرِ اثر بننی شروع ہوئی محمود غزنوی کے بعد آلِ غزنہ نے سندھ و پنجاب اور میرٹھ تک کے علاقے پر اپنی حکومت قائم کر کے لاہور کو اپنا دار الحکومت بنایا تو یہ "نئی زبان" ۱۰۲۶ء سے ۱۱۸۲ء تک اپنے خد و خال اس علاقے میں بناتی اور سنوارتی رہی۔ غوریوں کے ساتھ جب دہلی زیرِ نگیں آ گیا اور قطب الدین ایبک برعظیم کا پہلا بادشاہ بنا تو اختلاط و ارتباط کا عمل تیز ہو گیا۔ ۱۲۱۰ء میں التمش اپنا دار الحکومت لاہور سے دہلی لے گیا اور اس کے ساتھ پنجاب، ملتان اور سندھ کی اس کھچڑی زبان کا اقتدار دہلی پر بھی قائم ہو گیا۔ یہاں اس کا واسطہ دہلی اور دہلی کے قرب و جوار میں بولی جانے والی بولیوں سے پڑا۔ جنہوں نے اس کی ہیئت، ساخت اور شکل و صورت کو شدت سے متاثر کر کے اُسے ایک نیا روپ دے دیا۔ مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ ساتھ یہ زبان گجرات، دکن، مالوہ اور دوسرے علاقوں میں بھی پھیل گئی اور سارے برعظیم میں واحد مشترک زبان کی حیثیت سے

---

[1] اقتباسات از مقدمہ سندھ کے جدید اردو شعراء (صفحہ ۱۸)

www.taemeernews.com

بھرنے لگی :[1]

ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے تاریخ ادب اردو جلد اوّل میں قدیم شعرائے اردو کے کچھ نام اور ان کے کلام کا نمونہ بھی دیا ہے۔ تاریخ معصومی، ہندوستان عربوں کی نظر میں۔ عجائب الہند۔ مقالات حافظ محمود شیرانی جلد اوّل، تاریخ فیروز شاہی، ذخیرۃ الخوانین (قلمی) منتخب التواریخ، برہان پور کے سندھی اولیا، تاریخ شعرائے سندھ، سندھ میں اردو شاعری۔ مقالات الشعرا سے قدیم شعرا علما و ادبا کے نام منتخب کئے ہیں۔ شمس سراج عفیف، شیخ فرید بھکری، انجر بیگ چغتائی، میر محمد فاضل۔ سید محمد میر عدل۔ شاہ عبدالکریم بلڑی والے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی۔ سید ثابت علی ملتانی، میر بزرگی بندی۔ میر حیدالدین کامل۔ میر محمود صابر۔ میر حفیظ الدین علی (خسرو ثانی)، میاں محمد سرفراز عباسی۔ روحل خان روحل۔ حافظ عبدالوہاب سچل سرمست۔ مرادشاہ وغیرہ "

"مولوی عبدالحق (بابائے اردو) نے ایک خطبۂ صدارت جو مرکزِ علم و ادب (وادی مہران) کے کنونشن (میرپور خاص) میں بتاریخ ۱۹ دسمبر ۱۹۵۹ء پڑھا تھا۔ ہم اس خطبے سے چند ضروری اقتباسات پیش کرتے ہیں جس کا تعلق ہمارے موضوع سے ہے:

پاکستان کی ساری زبانیں ہماری اپنی زبانیں ہیں اور وہ سب ہمیں یکساں عزیز ہیں اور ان کی ترقی پاکستان کی ترقی ہے۔ ہر شخص کو مادری زبان عزیز ہوتی ہے اور عزیز ہونی چاہیے۔ اسے ترقی کا پورا حق حاصل ہے اور اس کی راہ میں کسی رکاوٹ کو حائل نہ ہونا چاہیے۔ لیکن ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ ایک علاقائی زبان خواہ کیسی ہی جاندار اور پُرمایہ ہو بہرحال علاقائی زبان ہے۔ اور اس کے نفوذ و اثر کا دائرہ ایک ہی علاقے تک محدود رہتا ہے لیکن ہر ملک میں ایک ایسی زبان بھی ہوتی ہے۔ جو ہر علاقے میں بولی۔ سمجھی۔ پڑھی یا لکھی جاتی ہے۔ یہی زبان پورے ملک کی قومی زبان کہلاتی ہے اور یہی زبان بلا اختلافِ مذہب و ملت سارے باشندگان ملک کی تہذیب تمدن اور ان کے نظریات، تصورات، خیالات اور رجحانات کی نمائندگی کرتی ہے۔ ہمارے ملک میں اردو زبان کو یہی حیثیت حاصل ہے اور اس لیے یہی ہماری قومی زبان ہے۔ ہمارے اسلاف نے اس زبان کی ترقی اور فروغ میں اپنی مادی ذہنی اور روحانی قوتیں صرف کی ہیں اور اسے اس رتبے تک پہنچا دیا ہے کہ ہم اس پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ اور اس کا سرمایہ اس قدر وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ وہ بھارت اور پاکستان سے نکل کر دور دور تک جا پہنچی ہے۔ ہم یہ تمام سرمایہ علاقائی زبانوں کی نذر کرتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ جب علاقائی زبانیں قومی زبان اردو سے مل کر اپنے ادب کے فروغ و ترقی کے لیے کوشش کریں گی، تو وہ بہت بڑی قوت بن جائیں گی۔

ہم سندھ میں یہی پیغام لے کر حاضر ہوئے ہیں اور اس یقین اور اعتماد کے ساتھ کہ اہلِ سندھ اپنی روایتی مہمان نوازی کے ساتھ اس پیغام کا خیر مقدم کریں گے۔ ہمیں سندھ اس لئے عزیز ہے کہ برصغیر میں سب سے پہلے اسی سرزمین پر اسلام کی روشنی پہنچی اور پھر یہیں سے توحید کی صدائیں بلند ہو کر ایک طرف ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں سے ٹکرائیں اور دوسری جانب جنوب کی معطر فضاؤں اور مشرق کے سبزہ زاروں

---

[1] تاریخ ادب اردو (جلد اول) از ڈاکٹر جمیل جالبی اقتباس از صفحہ ۹۷ ۔ ۶۴۴ ۔

〃 〃 〃 〃 〃 〃 صفحہ ۶۷۵ ۔ ۶۹۵

www.taemeernews.com

یاں گونجیں۔ ہمیں سندھ اس لئے عزیز ہے کہ یہیں حجازی تہذیب اور عربی ثقافت ہندِ قدیم کی تعلیم و روحانیت سے ہمکنار ہوئی اور پھر اس اشتراک و اتحاد سے ایک نئی تہذیب و ثقافت وجود میں آئی اور ہماری یہ قومی زبان اُردو اسی تہذیب و ثقافت کا شاہکار اور اس کی زندہ جاوید یادگار ہے۔

ہمیں سندھ اس لئے عزیز ہے کہ یہیں سے اسلامی علوم و فنون کی اشاعت ہوئی اور یہیں کے محدثین، فقہا، علما، فضلا، اولیا اور صوفیہ نے نبیِ امّی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سادہ، پُراثر اور انسانیت نواز تعلیمات کو ملک کے دوسرے گوشوں تک پہنچایا۔ ہمیں سندھ اس لیے عزیز ہے کہ اسی سرزمین سے شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین ذکریا ملتانی اور حضرت جلال الدین بخاری ایسے صاف باطن اور پاک مشرب بزرگوں کے روحانی فیوض و برکات کے چشمے پھوٹے اور سندھ ہمیں اس لئے بھی عزیز ہے کہ اس کی خاک کا ذرہ ذرہ لعل شہباز قلندر، شاہ عبداللطیف بھٹائی اور سچل سرمست ایسے خدا رسیدہ بزرگوں کے سرمدی نغموں سے سرشار اور ان کے وجدان و عرفان کا آئینہ دار ہے۔

اے اہلِ سندھ!

آپ کی تہذیب دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ہے۔ اور آپ کے بزرگوں نے تہذیب اور شائستگی میں جو عروج حاصل کیا تھا، آج بھی موہن جو ڈارو کے کھنڈر زبانِ حال سے اس کی عظمت کی داستانیں سنا رہے ہیں اور یہ بات بھی آپ کے لیے کچھ کم باعثِ فخر نہیں کہ جب آریاؤں کے قدم اس سرزمین پر آئے۔ تو پہلے پہل یہیں سے رگ وید کے روح پرور نغمے بلند ہوئے پھر محمد بن قاسم نے یہاں عربوں کی شوکت و سطوت کا پرچم بلند کیا۔ تو اس مردم خیز خطے نے ایسے ایسے جوہرِ قابل پیدا کئے کہ خود اہلِ عرب نے ان کے فضل و کمال کا اعتراف کیا۔ اگر میں سندھ کے ان تمام بزرگوں اور دانش وروں کا تذکرہ کروں۔ جنہوں نے شام اور عراق میں سندھ کے نام کو چار چاند لگائے۔ تو اس کے لیے دفتر کے دفتر ناکافی ہوں گے۔ شاید آپ کو سُن کر حیرت اور تعجب ہو کہ اس دور میں یہاں سے ایک صاحب جن کا نام ابو معشر سندھی تھا۔ جنگی قیدیوں کے زمرے میں حجاز پہنچے۔ تو انہوں نے وہاں علمِ حدیث میں اس درجہ کمال حاصل کیا کہ ائمہ حدیث میں شمار ہونے لگے اور امام شافعیؒ کے استاد امام وکیع، امام ثوری اور واقدی جیسے مشاہیرِ وقت نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ حافظ ابو محمد خلف بن سالم اور ابو نصر سندھی بھی اس دور کے مشہور محدثین میں ہیں۔ جنکی روایتوں کو امام نسائی اور دارمی نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔ علمِ حدیث میں سندھ کے اگلے بزرگوں نے جو امتیاز حاصل کیا تھا۔ وہ صدیوں برقرار رہا۔ چنانچہ دہلی، آگرہ، جون پور، برہان پور جیسے بڑے علمی اور تہذیبی مرکزوں کے اہلِ علم حتیٰ کہ شاہ عبدالحق محدث دہلوی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی یہاں کے باکمالوں سے علمِ حدیث حاصل کیا۔ عربی ادب اور شعر میں بھی اس مردم خیز خطے نے ابو العطا سندھی اور ابو ضلع سندھی ایسے خوش گفتار اور سخن سنج پیدا کئے۔ اہلِ زبان کو بھی ان کا لوہا ماننا پڑا۔ غرض کہ صدیوں سندھ کی علمی مرکزیت اور ادبی اہمیت پورے برِعظیم کے لئے قابلِ رشک رہی اور آخر وہ وقت بھی آ پہنچا کہ یہاں کی ساری علمی روایات داستانِ پارینہ بن کر رہ گئیں اور وہی سندھ جو کبھی علمی و ادبی حیثیت سے میرِ کارواں کی حیثیت رکھتا تھا۔ پستی و پس ماندگی کا شکار ہو گیا اور انگریز حکومت کے دور میں تو یہ زوال اپنی آخری حد کو پہنچ گیا۔

اہلِ سرحد باوجودیکہ ان کی مادری زبان اردو نہیں۔ اردو پر ایسی ہی قدرت حاصل کر لیتے ہیں۔ جیسی اہلِ زبان کو ہوتی ہے تو

www.taemeernews.com

کوئی وجہ نہیں کہ اہلِ سندھ کو بھی اُردو پر ویسا ہی عبور حاصل نہ ہو سکے۔ سندھی اور اردو رسم خط ایک ہے۔ دونوں کا ذخیرہ الفاظ بھی بڑی حد تک مشترک ہے اور دونوں کی صرف و نحو بھی ملتی جلتی ہے۔ ان آسانیوں کے باوجود بھی اگر اہلِ سندھ اردو کو ایک مشکل زبان سمجھتے ہیں تو یہ ان کی بڑی بھول ہوگی۔ اردو زبان سندھ کے لیے اجنبی اور نامانوس نہیں اور بعض محققین کا تو یہاں تک خیال ہے کہ اردو زبان کا مولد و منشا وادیِ مہران ہے۔ اس دعوے کی بنیاد یہ ہے کہ اُردو مسلمانوں اور ہندوؤں کے میل جول اور ان کے تہذیبی و ادبی اختلاط سے پیدا ہوئی ہے اور چونکہ پہلے پہل یہیں عربوں کی حکومت قائم ہوئی اور اس لیے لامحالہ اردو نے بھی یہیں جنم لیا ہوگا۔ اردو سندھ میں پیدا ہوئی یا گجرات اور دکن میں۔ یہ موقع اس سوال کے چھیڑنے کے لئے مناسب اور موزوں نہیں لیکن بہرحال یہ حقیقت ہے کہ صدیوں پہلے بھی یہاں اردو کے استعمال کا سراغ ملتا ہے۔ چنانچہ جب محمد تغلق نے ٹھٹھہ کی تسخیر کے لیے سندھ پر فوج کشی کی اور پھر یہیں کی خاک کا پیوند ہو کر رہ گیا اور دس برس بعد دوبارہ پھر فیروز تغلق نے ٹھٹھہ پر چڑھائی کی اور رسد کی عدم فراہمی کی وجہ سے اسے جب اپنا ارادہ منسوخ کرنا پڑا تو یہاں کے لوگوں نے اسے اپنے یہاں کا ایک پیر کرامت قرار دیا اور یہ جملہ ضرب المثل کی طرح زبانوں پر رواں ہو گیا:

"برکتِ شیخ پتھا ایک موا ایک ہٹا"

انگریزوں کی عملداری سے بہت پہلے سندھ کے صاحبانِ فہم اور یہاں کے شرفا فارسی اور سندھی زبانوں میں شعر کہنے کے ساتھ اُردو میں بھی مشقِ سخن کرتے تھے۔ چنانچہ مقالات الشعرا کے مصنف میر علی شیر قانع ٹھٹھوی نے جو کبھی کبھی خود بھی اردو میں شعر کہتے تھے، اپنے تذکرے میں شیخ ورد عبدالسبحان فائز ٹھٹھوی، سید حیدر الدین کامل، میر حفیظ الدین، غنی، پرسرام مشتری اور دیگر سندھ نژاد اردو شعرا کا ذکر کیا ہے۔ تو پیارے دوستو! جب آپ کے اسلاف اب سے پہلے زبان دانوں کی طرح اردو شعر کہنے پر قادر تھے تو پھر یہ غلط خیال کیونکر آپ کے ذہنوں میں پیدا ہوا کہ آپ جو ان کے جانشین اور یادگار ہیں اردو زبان اور ادب کے میدان میں کسی سے پیچھے رہ جائیں گے۔ جس اردو زبان کو آپ کے بزرگوں نے اپنا کر اس میں امتیازی مقام حاصل کیا۔ آپ بھی آج ان کے نقشِ قدم پر چل کر اپنی اہمیت ثابت کر سکتے ہیں[1]۔"

زبان اور علمِ زبان میں پروفیسر عبدالقادر سروری رقمطراز ہیں:

"عربی و فارسی بولنے والے لوگ سب سے پہلے سندھ میں آباد ہوتے اور تقریباً ڈیڑھ، پونے دو سو سال تک اس علاقے پر ان کا تسلط رہا۔ اس بنا پر مولانا سید سلیمان ندوی کا قیاس یہ ہے کہ اردو کا ہیولیٰ سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔ لیکن ہمارے پاس اس وقت اس زمانے کے تحریری آثار موجود نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں شاید ملتان کا علاقہ جو سندھ اور پنجاب کی سرحدوں پر واقع ہے، کچھ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ مقام مسلمانوں کی حکومت سندھ کے زمانے میں اور بعد میں بھی علما کا بڑا مرکز رہا اور دکنی جو دکن آنے والے ابتدائی دور کے مسلمانوں کے ساتھ اس علاقے

---

[1] خطباتِ عبدالحق اقتباسات از صفحہ (۵۹۹ - ۶۰۵)

www.taemeernews.com

میں آئی تھی۔ بعض خصوصیتوں میں ملتانی سے مشابہت رکھتی ہے۔ شیخ فرید گنج شکرؒ، جن کا کلام کچھ اردو کلام دستیاب ہوا ہے۔ اور اردو کے اولین آثار میں سے ہے ملتان ہی سے دہلی آئے تھے۔

حافظ محمود شیرانی نے اردو کا نشوونما پنجابی سے بتایا ہے اور اپنے خیال کی تائید میں تاریخی اور لسانی حقائق پیش کئے ہیں کہ غوریوں کے غزنین پر قبضہ کر لینے کے بعد محمود غزنوی کی اولاد اپنے مشرقی علاقہ پنجاب میں منتقل ہو گئی تھی اور کوئی پونے دو سو برس تک پنجاب پر ان کی براہِ راست حکومت رہی اس دوران میں مسلمان علما اور مبلغین کی تبلیغ کے اثر سے" ہندستانیوں کی ایک بڑی تعداد اسلام قبول کر چکی تھی۔ ہندوستانی مسلمان ظاہر ہے کہ پرانی پنجابی بولتے تھے۔ لیکن مذہبی اور تہذیبی تعلق کی وجہ سے وہ فارسی بولنے والوں سے گہرا ربط کرنے پر مجبور تھے۔ چنانچہ اس ربط کا نتیجہ اردو زبان کے آغاز کی صورت میں ظاہر ہوا۔"[1]

جناب نصیر الدین ہاشمی نے دکن میں اردو کے صفحہ ۲ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے سندھ میں اردو کے متعلق اپنی رائے اس طرح قائم کی ہے:

" یہ امر تقریباً تصفیہ شدہ ہے کہ اردو مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی میل جول سے پیدا ہوئی ہے۔ اس لیے جن صاحبوں کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کی ابتدا سندھ اور دکن سے ہوئی۔ ایک حد تک غلط نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ان ہی مقامات پر ہوئی سندھ میں اسلامی حکومت کا آغاز ۹۲ھ / ۷۱۲ء سے ہو چکا تھا۔ صدیوں تک وہ یہاں حکومت کرتے رہے۔ حکومت کی رواداری اور ہندو مسلمانوں کے عام طور سے ملنے جلنے کی وجہ سے ایک دوسرے کو سمجھنے اور باہمی تبادلۂ خیالات کے مواقع پیدا ہو گئے۔ ان حالات کے مدنظر اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ ہندو اور مسلمانوں کے امتزاج سے جو زبان بنی اس کا آغاز اسی مقام سے ہوا ہے۔ جو غلط نہیں ہو سکتا۔ لیکن تحقیقات ہوئی ہے۔ اس کے لحاظ سے یہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ان فاتحوں کی اصلی زبان عربی تھی۔ اس لحاظ سے جو زبان عالم وجود میں آئی وہ عربی اور سندھی سے مشترک ہوتی۔ مگر چونکہ اس میں فارسی کا حصہ زیادہ ہے اس لئے ہم یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ اردو کی ابتدا سندھ سے نہیں ہوئی۔ سندھ کے بعد مسلمانوں کی آمد سواحل ملیبار اور کرناٹک پر ہوئی۔ شیوخِ عرب اور سردارانِ آلِ ہاشم تجارت اور تبلیغِ دین کی دُھن میں صدہا میل سمندر کی راہ طے کر کے پُرامن طریقہ سے سواحلِ ہند پر پہنچے اور اپنی کوشش اور جدوجہد سے سواحل کے ہندوؤں میں خاص رسوخ حاصل کر لیا اپنی ملنساری اور نیک مزاجی سے ان کے دلوں میں گھر کر لیا اور وہ سواحل سے گزر کر اندرون ملک میں دُور تک پہنچ گئے۔ اپنی مسجدیں تعمیر کیں اپنی حکومتیں قائم کیں اپنے مذہب کی اشاعت کی اپنی تعلیم کی تلقین کی۔[2] "

سندھ میں عربوں کی حکومت کے عنوان سے حکیم سید شمس اللہ قادری اپنی تالیف اردوئے قدیم میں فرماتے ہیں:۔

" فارسی اور انگریزی مورخین کا یہ بیان کہ محمد بن قاسم کے بعد سندھ کی اسلامی حکومت تباہ ہو گئی اور ملک پر ہندوؤں نے

---

[1] دکن میں اردو (طبع ششم) ص ۸ طبع نسیم بک ڈپو لکھنؤ

[2] اردوئے قدیم از حکیم شمس اللہ قادری ص ۸ طبع کراچی

www.taemeernews.com

قبضہ کر لیا۔ بلکہ عربی تاریخوں سے ثابت ہوتا ہے کہ خلیفہ الواثق باللہ (۲۲۷ھ/۲۳۲ھ) کے زمانے تک دربارِ خلافت سے سندھ میں گورنر مقرر ہو کر آتے تھے اور منصورہ ان کا مستقرِ حکومت تھا۔ جب خلافتِ بغداد کو انحطاط شروع ہوا تو سندھ میں خلفا کی حکومت برائے نام رہ گئی۔ اور ملک میں عربوں کے جو قبائل آباد تھے۔ ان کے سرداروں نے چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم کر لیں۔ یہ حکومتیں کشمیر کی سرحد سے بحرِ فارس اور سیستان اور مکران تک پھیلی ہوئی تھیں اور ان کے حکمران سلاطینِ شنسبانیہ کے تسلط تک ملکِ سندھ پر قابض و متصرف رہے۔

عربوں کے دورِ حکومت سندھ میں سندھ کی اسلامی آبادی:۔

"سندھ کے فاتحین عرب مسلمان تھے۔ یہ لوگ جب سندھ میں آئے تو اپنے ساتھ عربی زبان اور عربی تمدن لیتے آئے اور اسے ملک میں اس قدر پھیلایا کہ سندھ شام و عراق کا نمونہ بن گیا۔ سندھ میں کم و بیش پانسو سال ان کی حکومت رہی ہے اس عرصہ میں عراق و عرب کے سیکڑوں قبائل نے آ کر سندھ میں سکونت اختیار کر لی اور یہاں کے باشندوں کے ساتھ اس قدر اختلاط بڑھایا کہ دونوں میں امتیاز کرنا اجنبی کے لئے دشوار ہو گیا۔

ابن حوقل[1] جو چوتھی صدی کا مشہور سیاح ہے جب سندھ میں آیا۔ تو دیکھا یہاں کے ہندو مسلمان دونوں کی ایک سی معاشرت ہے۔ دونوں ایک زبان بولتے ہیں۔ سندھ میں عربی اور سندی بولی جاتی ہے۔ ملتان میں ملتانی اور فارسی کا رواج ہے[2]۔"

جو اقتباسات اوپر بیان کئے جا چکے ہیں ان کی روشنی میں فاتحینِ اسلام کا سندھ میں ورود اور ان کا سندھ کے اصلی باشندوں سے اختلاط، عربی و فارسی ترکی کا قدیم زبان سے میل جول۔ تاجروں اور مسافروں کی برابر آمد و رفت سے ایک مرکب بولی کا پیدا ہو جانا سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور سید سلیمان ندوی کا یہ فرمان آج تک زیرِ بحث آ رہا ہے کہ۔

"جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ اس وادیٔ سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔"

(نقوشِ سلیمانی ص۳۱)

زبانِ اردو

(یہ مضمون ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے جو رسالہ مخزن بابت ستمبر ۱۹۰۲ء میں مدیرِ مخزن شیخ عبدالقادر کے نوٹ کے ساتھ شائع ہوا ڈاکٹر وائٹ برجنٹ صاحب جن کو السنۂ مشرقیہ کے ساتھ بالخصوص دلچسپی ہے۔ یہ مضمون انگریزی میں لکھا جس کا ترجمہ

---

[1] ابن حوقل نے ۳۳۱ھ سے ۳۵۹ھ تک بلادِ اسلامیہ میں سفر کیا۔ اور ۳۶۶ھ میں اپنا سفرنامہ مدون کیا جس کا نام المسالک الممالک ہے۔

[2] اردوئے قدیم ص۲۱ طبع کراچی۔

www.taemeernews.com

علامہ اقبال نے اُردو زبان میں کیا جو ذیل میں درج ہے۔ اس سے اردو زبان کی ابتدا کے
متعلق روشنی پڑتی ہے)

اردو زبان کی ابتدا شہنشاہ اکبر (۱۵۵۶ء — ۱۶۰۵ء) کے عہد سے ہوئی۔ ہمایوں کے عہد میں سلطنتِ مغلیہ پنجاب اور مضافات دہلی و آگرہ تک ہی محدود تھی۔ مگر اکبر کی ذکاوت اور اس کی قوتِ انتظام نے چھوٹے سے علاقے کو ایک عظیم سلطنت بنا دیا جو کابل اور قندھار کی سرحد سے شروع ہو کر اوڑیسہ اور حدودِ آسام تک پہنچتی تھی۔ اس کا دارالخلافہ کبھی دہلی ہوا کرتا تھا۔ کبھی آگرہ اور ان شہروں کے درمیان اضلاع کی زبان مغربی ہندی کی ایک شاخ تھی۔ جس کو برج بھاشا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ غالب خیال یہ ہے کہ اکبر کے عہد تک مسلمان بھی ہندوؤں کے ساتھ میل جول کرنے میں برج بھاشا بولا کرتے تھے مگر شہنشاہ مذکور کے زمانے سے اس تغیر کا آغاز ہوتا ہے۔ جس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوا کہ ضرورت نے نئی زبان پیدا کر دی۔ اکبر کے کئی وزراء بالخصوص وزیر مال ہندو تھے۔ جن کو تقاضائے وقت کی وجہ سے اس وقت کی درباری زبان یعنی فارسی سیکھنی پڑی۔ جس طرح انگلستان میں شاہانِ نارمن کے عہد میں اینگلو سیکسن اور نارمن فرنچ کی آمیزش سے انگریزی زبان کا آغاز ہوتا ہے۔ اسی طرح ہندوستان میں فاتحوں اور مفتوحوں کی زبان کی آمیزش سے یا یوں کہو کہ فارسی اور برج بھاشا کے ازدواج سے اردو زبان پیدا ہوئی۔ فارسی بولنے والے مسلمان سپاہی کو روزمرہ کے کاروبار میں دہلی اور آگرے کے باشندوں کے ساتھ برتاؤ کرنا پڑتا تھا۔ اس آمیزش کے اور بھی ممد ہوتے۔ یہاں تک کہ ہندی مغربی قشون شاہی یعنی اردوئے معلیٰ کے نام پر اردو کہلانے لگی۔

حکومتِ مغلیہ کی توسیع کے ساتھ ساتھ شمالی اور کسی حد تک جنوبی ہندوستان میں بھی تعلیم یافتہ لوگوں میں اس زبان کی ترویج ہوتی گئی اور ہندوستانی مسلمان مصنفین کی فارسی تواریخ و اشعار کے ساتھ اس نئی زبان کا علم ادب بھی ترقی کرتا گیا۔ دو صدیوں تک تو محض یہ علم ادب صرف مذہبی اور عاشقانہ نظموں تک محدود تھا۔ جن کے مطالعہ سے زبان کی تدریجی نشوونما کا سراغ ملتا ہے۔ لیکن سولھویں صدی کے اختتام سے پیشتر مسلمان شعرا کی طبع آزمائیاں شروع ہوتی ہیں۔ اگرچہ ان کا عروض اور ان کی زبان زیادہ تر ہندی اصل کی ہیں ۱۶۰۰ء کے قریب اردو شعرا فارسی بحور کا استعمال شروع کرتے ہیں اور رفتہ رفتہ فارسی الفاظ و محاورات اردو زبان میں کثرت سے داخل ہوتے جاتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے اختتام کے قریب ۱۷۹۰ء اردو نثر کا پہلا نمونہ یعنی شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمۂ قرآن شریف شائع ہوتا ہے مگر چونکہ اس کے مصنف نے عربی محاورات و الفاظ و استعارات کی اندھا دھند تقلید کی ہے اس واسطے یہ ترجمہ تصانیف ادبیہ میں شمار کئے جانے کا مستحق ہے۔

آخر انیسویں صدی کے شروع میں اردو مصنفین نے یہ محسوس کیا کہ نثر اظہارِ خیالات و تاثراتِ قلبی کا ایک موزوں آلہ ہے اس میں شک نہیں کہ اُردو نثر کے نشوونما میں ایک بے جا تعویق لاحق ہوئی ہے۔ تاہم یہ تعویق اپنے فوائد سے خالی نہیں رہی مسٹر جیمز فرماتے ہیں:

"بدقسمتی سے ہر ہندوستانی زبان کا یہی حال رہا ہے کہ جب مصنفین نے ایک زبان میں لکھنا شروع کیا۔ تو ان کی طرزِ تحریر سے قدرتی رنگ معدوم ہوگیا اور تصنع اور بناوٹ

نے یہاں تک زور پکڑا کہ متاخرین نے متقدمین کی طرزِ تحریر کو بغیر کسی تبدیلی کے اختیار کر لیا ہے"

لیکن اُردو زبان اس قید سے مستثنیٰ تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں بعض فارسی تصنیفات کی تقلید سے اُسے نقصان پہنچا تاہم یہ صحیح ہے کہ اُردو نثر نویسوں نے بالعموم ایسی طرزِ تحریر کو اختیار کیا جو وقت کے تقاضے سے خود بخود پیدا ہوئی اور جو بناوٹ سے آزاد ہونے کی وجہ سے عوام کے فہم اور سمجھ کے عین مطابق ہے۔

موجودہ صدی میں اُردو نثر کی ترقی کے تین بڑے قوی اسباب ہوئے ہیں:۔

اوّل۔ چھاپہ خانہ کی ترویج جو مسیحی واعظوں بالخصوص سیرام پور کے واعظوں کی وساطت سے ہوئے۔

دوم زبانِ انگریزی نے جو ۱۸۳۲ء میں مسیحی واعظوں اور بالخصوص ڈف صاحب کے مساعی جمیلہ سے ہوئی اور جس نے ہندوستان کی زبانوں پر مغربی علمی خزائن کے دروازے کھول کر ان پر وہ احسان کیا جو گم شدہ یونانی علم وادب کی دریافت نے یورپ کی زبانوں پر کیا تھا۔ مغربی علوم وفنون کی ہوا نے اردو زبان میں ایک نئی روح پھونک دی ہے اور شاید ہندوستان کی کوئی اور زبان اس مغربی اثر سے اس قدر متاثر نہیں ہوئی جس قدر کہ یہ زبان ہوئی۔

سوم اردو زبان کا فارسی کے بجائے درباری زبان قرار دیا جانا اس واقعہ کے اثر نے پٹنہ اور پشاور کے درمیان ممالک کو اُردو کے زیرِ نگیں کر دیا ہے اور چونکہ دہلی اور آگرہ کو اب دارالخلافہ ہونے کا شرف نہیں رہا۔ اس واسطے زبان مذکور کے ادبی تحریکات کے مرکز لاہور اور الٰہ آباد قرار پا گئے ہیں۔

اردو کی ماں یعنی برج بھاشا کا اثر تو دہلی اور آگرہ تک ہی محدود تھا مگر بانکی بیٹی کو خدا نے وہ شرف بخشا کہ آج شمالی ہندوستان میں تین لاکھ مربع میل پر اس کا دَور دورہ ہے بلکہ جنوبی اور مغربی ہندوستان کے بعض وسیع اضلاع بھی اس کی حکومت سے آزاد نہیں۔ اس کے علاوہ کئی مقامات میں جن مقامی بولیوں کے علاوہ گویا زبان ثانی تصور کی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے اُردو بولنے والوں کی تعداد کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے۔ باوجود اس اشکال کے ہم گریرسن صاحب کی تحقیقات کے مطابق زبان مذکورہ بولنے والوں کی تعداد درج کرتے ہیں اور صاحب موصوف کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ جنہوں نے از روئے کرم ہمیں اپنا مسودہ عطا فرمایا:۔

راجپوتانہ وغیرہ	۵۲۹۰۸۹	پنجاب	۵۸۹۶۱۱
ممالک متوسط	۱۵۵۰۱۴	صوبجات متحدہ اور اودھ۔	۳۴۸۶۳۶۰
حیدر آباد	۲۷۰۴۰۰	بنگال	۱۷۶۲۴۸۸
بمبئی	۱۳۰۱۲۲۲		

میزان : ۸۰۰۴۱۸۴

مدراس کے اردو بولنے والوں کی تعداد میں کچھ بہت بڑا اضافہ نہیں کر سکتی لہٰذا مندرجہ بالا تعداد کم و بیش ہندوستان کے خالص اردو بولنے والوں کی سمجھی جانی چاہیئے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ جزوی طور پر اردو زبان کی وسعت ان حدود سے وسیع تر ہے۔ مثلاً پنجاب کے ایک کروڑ مسلمان باشندوں اور ایک کروڑ ۵ لاکھ مسلمان بنگالی بولنے والوں کے درمیان اردو جزاً مروج ہے۔ مزید براں مندرجہ بالا

www.taemeernews.com

.. لاکھ اُردو بولنے والوں میں غالباً لکھ پڑھ سکنے والوں کی تعداد شاید اس قدر ہے کہ کسی اور دیسی زبان کے بولنے والوں میں اس قدر نہ ہوگی۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو اردو کو بطور ثانی استعمال کرتے ہیں۔ ان لوگوں میں سے اکثر مثلاً اہلِ پنجاب نے اُردو مدرسوں میں پڑھ کر سیکھی ہے۔

بعض مغربی مصنفین کی رائے ہے کہ اُردو ہندی سے کوئی الگ زبان نہیں ہے کیونکہ اس کی صرف و نحو کلیتہً ہندی اصل کی ہے۔ جیمز صاحب فرماتے ہیں کہ اردو کو ہندی زبان سے متمیز کرنا غلطی ہے۔ گرچہ ہندی بولنے والے مقامات میں مقامی بولیوں کے درمیان بہت سا اختلاف ہے تاہم ایک عام مشترک بولی متعارف ہے جس کو تمام تعلیم یافتہ لوگ استعمال کرتے ہیں۔ اس مشترک بولی کی ابتدا مضافات دہلی سے ہوئی اور ہندی کی وہ شکل جو اس شہر کے گرد و نواح میں بولی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ ایک نئی زبان بن کر اختیار کر لی گئی۔ جیمز صاحب ٹھیک فرماتے ہیں۔ مگر وہ اس امر کو نظر انداز کرتے ہیں کہ اس نئی زبان کا اختیار کیا جانا ہی گویا اردو زبان کی ابتدا تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو برج بھاشا شمال مغرب ہندوستان کے ایک تھوڑے سے حصہ تک محدود رہتی اور اس کی حیثیت ایک معمولی بولی کی حیثیت سے بڑھ کر نہ ہوتی۔ ڈاکٹر ہارنل نے ٹھیک کہا ہے کہ اُردو برج بھاشا کی ایک تبدیل شدہ صورت ہے جس نے بھاشا کی گردانوں کے الجھاؤ سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا ہے اور بعض صیغے جو پنجابی اور مارواڑی کے ساتھ مختص ہیں رکھ لئے ہیں۔ پس اردو بلحاظ صرف و نحو کے ہندی الاصل ہے۔ جس میں کچھ مارواڑی اور پنجابی اجزا بھی شامل ہیں اور بلحاظ الفاظ و اصطلاحات کے اس کی اصل کچھ ہندی اور کچھ فارسی و عربی وغیرہ بلکہ اس کے مصنفین نے کئی ملکی محاورات کا ہندی ترجمہ کرکے اپنی زبان کے ذخیرۂ محاورات کو زیادہ کیا ہے۔ مثلاً محنت کھینچنا۔ پھل لانا۔ وغیرہ محنت کشیدن اور بار آوردن کا ترجمہ ہیں۔ کتابی ہندی کی ابتدا ہی اس صدی سے ہوتی ہے یہ گویا اس اثر کا نتیجہ ہے جو انگریزی تعلیم نے زمانۂ حال کے ہندوؤں پر کیا ہے اگرچہ حقیقت میں یہ کتابی ہندی وہی اردو ہے جس میں غیر ملکی الفاظ و محاورات کی جگہ تصنع سے ہندی محاورات اور سنسکرت کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی زبان بولنے والے ممالک کے تعلیم یافتہ ہندو کتابی ہندی کو آسانی سے سمجھتے ہیں اور برج بھاشا بولنے والے اس فہم سے عاری ہیں۔ ہمارے نزدیک ڈاکٹر ہارنل نے جو اردو مشرقی ہندی اور مغربی ہندی میں امتیاز کیا ہے بالکل صحیح نہیں اور اُردو مشرقی اور مغربی ہندی سے اس طرح ممیز ہے جس طرح انگریزی ڈچ اور جرمن سے فی زمانہ انگریزی زبان کی طرزِ تحریر اردو زبان پر بہت اثر کر رہی ہے۔ اُردو اخبارات اور تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی بولی انگریزی زبان کے الفاظ و محاورات سے معمور ہوتی ہے۔ اگرچہ مستند اردو مصنفین کی تحریروں میں انگریزی الفاظ و اصطلاحات کو چنداں دخل نہیں ہے۔ تاہم بہت سے الفاظ آہستہ آہستہ ان تحریروں میں آتے جاتے ہیں مثلاً توبۃ النصوح کے مصنف نے الفاظ انٹرسٹ، انٹرنس، البم، فری میسن، ریڈ، پنسل، ڈاکٹر وغیرہ کو استعمال کیا ہے اور ان کی طرزِ تحریر اور لکھنے کا ڈھنگ انگریزی طرزِ ادا سے متاثر ہوتا جاتا ہے۔ اس اثر کا نتیجہ خود واضح ہو جائے گا۔ جیمز صاحب اس امر کے متعلق یوں پیشن گوئی کرتے ہیں:

غالب گمان یہ ہے کہ ریلوں، سڑکوں اور دیگر وسائل آمد و رفت کی توسیع سے پنجابی اور راجپوتانہ کی دیگر مقامی بولیاں معدوم ہو جائیں گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اٹک سے راج محل تک اور ہمالہ سے وندھیاچل تک

www.taemeernews.com

ایک ہی زبان ہندی معرض یعنی اردو کا دور دورہ ہو جائے گا۔ اس وقت اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس کروڑ سے بھی زیادہ ہوگی اور یہ زبان اپنی عظیم الشان وسعت اور روز افزوں وقعت کے باعث اپنی ہمسایہ زبانوں پر بھی ایک بڑا اثر ڈالے بغیر نہ رہے گی جوں جوں مقامی اتحاد کے وسائل اور ملک کے مختلف حصص کے تعلقات بڑھتے جائیں گے توں توں یہ سادی شستہ بانکی اور ہر قسم کے مطالب کو ادا کرسکنے والی اردو زبان جو ہندوستان کے اکثر حصوں میں بولی جاتی ہے اور جو حکمران قوم کو انگریزی زبان کے ساتھ تشابہ رکھنے کے باعث بالخصوص مرغوب ہے۔ ہندوستان کی اکثر دیگر زبانوں پر غلبہ حاصل کرتی جائے گی اور بالآخر وقت آ جائے گا۔ جب کہ تمام آریا ہندوستان کی زبان ایک ہو جائے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو زبان اور انگریزی زبان کی تاریخ میں ایک عجیب و غریب مماثلت ہے اور ولیم کوپر شاعر انگلستان کے دلفریب الفاظ دونوں پر صادق آتے ہیں۔

"اے انگلستان اس مدت مدید کے بعد بھی تیری زبان پر تیرے فاتحین
کا اثر نمایاں معلوم ہوتا ہے شستگی، بانکپن اور لطف ادا اس کے
خاص جوہر ہیں اور یہ خیالات و الفاظ کے گرانمایہ موتیوں سے دمک
رہی ہے۔ جو تیرے فاتحین پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔"

(اقبال کے نثری افکار از (صفحہ ۲۹ تا صفحہ ۳۲) از عبدالقادر شکیل
طبع انجمن ترقی اردو ہند دلی)

---

www.taemeernews.com

مسئلہ زبان

معرکہ آرا: پنڈت برجموہن دتاتریہ - ڈاکٹر ذاکر حسین - ڈاکٹر تاراچند ڈاکٹر راجندر پرشاد - مولوی عبدالحق - بیرسٹر آصف علی

اُردو، ہندی اور ہندوستانی

مسٹر کرم چند گاندھی نے جنکو ہندو قوم مہاتما کے نام سے یاد کرتی ہے ۔ ۱۹۳۶ء میں ایک نعرہ بلند فرمایا کہ ہندوستان کے ملک کی زبان کو کیا اردو ہندی یا ہندوستانی کا نام دیا جائے؟ یہ تنازعہ عوامی سطح کے مختلف نعروں میں نمودار ہوا۔ پھر اسے سرکاری سطح پر لے جانے کی سعی کی گئی ۔ انڈین نیشنل کانگریس اپنے آپ کو ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت تصور کرتی تھی ۔ وہ اس معاملے کے درمیان آگئی ۔ عام طور سے "اردو" کو مسلمانوں کی اور "ہندی" کو ہندوؤں کی زبان سمجھا جاتا تھا ۔ اس لئے کانگریس کے نیتاؤں نے وقت کی ضرورت کو محسوس کیا ۔ کہ ایک تیسری زبان تخلیق کی جائے جو نہ اُردو ہو اور نہ ہی ہندی بلکہ ایک ایسی زبان ہو جو دونوں طبقوں میں مقبولیت حاصل کرنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہو اور اسے "ہندوستانی" کہا جائے اور ملک کے تمام سکولوں اور کالجوں میں اسے رائج کر دیا جائے ۔ ان ہی دنوں بہار گورنمنٹ نے ایک کمیٹی کی تشکیل بھی کر لی اور اس نئی زبان کو "ہندوستانی" کا نام دے کر اس کی گرامر لغت اور سکولوں کے لئے ابتدائی درجے کی کتابیں تک مرتب کرنے کی داغ بیل ڈال دی اور اس کے ساتھ یہ خیال رکھا کہ اردو اور ہندی سے عربی اور سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ یکسر خارج کر دیئے جائیں اور جو الفاظ دونوں زبانوں کے مستند ادیب و شاعر اپنی تحریروں اور نظموں میں لکھتے آرہے ہیں ان کو ٹکسالی سمجھ کر اپنا لیا جائے ۔ اُردو چونکہ عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور ہندی کا رسم الخط ناگری حروف میں ہے ۔ یہ نکتہ بھی ہندو قوم کے پیش نظر تھا کہ رسم الخط بھی تبدیل کر دیا جائے جس پہ مختلف علمائے اردو نے اختلافی مضامین لکھے اور ہندوؤں کے ان خطرناک منصوبوں کو بے نقاب کرتے رہے ۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کی ایک جماعت بھی اپنی ذاتی اغراض کے ماتحت ہندو کانگریس کی ہمنوا ہو گئی تھی اور ان کا آلہ کار بن کر "ہندوستانی" کے حق میں پروپگنڈہ کرتی رہی ۔ لیکن مسلمانوں کی ایک کثیر جماعت نے کانگریسی رہنماؤں اور مٹھی بھر نیشنلسٹ مسلمانوں کی نیت کو بھانپ لیا اور خم ٹھونک کر میدانِ عمل میں آگئی اور مسلم لیگ کے پرچم کے نیچے جمع ہو گئی ۔ اُردو چونکہ مسلمانوں کی مذہبی زبان بھی تھی ۔ اس لئے وہ انھیں جان سے پیاری تھی اور اس زبان کا نام "اُردو" کوئی آج کی پیداوار نہیں تھا بلکہ بہت پہلے سے رائج چلا آرہا تھا انڈین نیشنل کانگریس کی یہ ہٹ کہ اُردو اور ہندی کی بجائے ہندوستانی نام کو رائج کیا جائے اور اردو کے خلاف اس یکطرفہ فیصلے کا ردعمل شدید ہوا اور ہندوستان پھر اس تحریک کی لپیٹ میں آگیا ۔ چنانچہ اس لسانی اور سیاسی چپقلش کے موقع پر آل انڈیا ریڈیو نے ملک کے ممتاز دانشوروں کو اس موضوع پر اظہار خیال کرنے کی دعوت دی ۔ یہ تقاریر ۲۰ فروری ۱۹۳۹ء سے ۲۵ فروری ۱۹۳۹ء تک نشر کی گئیں ۔ مقررین میں تین مسلمانوں کا انتخاب عمل میں آیا اور تین ہندوؤں کا ۔ مسلمانوں میں ۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور مسٹر آصف علی بیرسٹر تھے اور ہندوؤں میں ڈاکٹر راجندر پرشاد ڈاکٹر تاراچند اور پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ۔ ریڈیو کے محکمے نے نشر ہونے والی خبروں کے دو نسخے بھی ان صاحبان کی خدمت میں اس غرض

www.taemeernews.com

سے بھیجے کہ وہ ان کے مطالعہ کے بعد رہنمائی کریں کہ ریڈیو کی زبان کیسی ہونا چاہیے۔

۱۔ "فیڈرل پبلک لیجر کے لئے فہرست رائے دہندگان تیار کرنے کے سلسلے میں جو ابتدائی کارروائی کی جائے گی اس کے بارے میں سر این۔ این۔ سرکار، لاممبر نے آج اسمبلی میں روشنی ڈالی۔"

۲۔ "سنکت پراتنیہ دیو ستھا پکا پریشد میں ایک پرشن کا اُتر دیتے ہوئے نیائے منتری ڈاکٹر کاٹجو نے ان ادیوگ دھندوں کی سوچی دی۔ جن کی انتی کے لئے سرکار نے سہاتیا دینا سویکار کیا ہے۔"

یہ چھ معرکہ آرا تقاریر آل انڈیا ریڈیو کے نشر ہونے کے بعد "تیج دیکا" دہلی میں یکے بعد دیگرے طبع ہوئیں اور دہلی ہی سے کتابی شکل میں بھی محفوظ کرلی گئیں۔ یہ تقاریر اہم بھی ہیں اور دلچسپ بھی ان کے مطالعہ سے ہندو ذہنیت آئینہ ہو جاتی ہے بحیثیت مسلمانوں کے خیالات کا بھی تجزیہ ہوتا ہے۔ اور اُردو کے حامی دانشوروں کے سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے اور ان شخصیتوں کے علمی مرتبہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

پہلی تقریر مشہور مؤرخ ڈاکٹر تارا چند کی ہے جو آل انڈیا ریڈیو سے ۲۰ فروری ۱۹۳۹ء کو نشر کی گئی۔ جس کا کچھ اقتباس ذیل میں درج ہے

ہندستانی کیا ہے؟

۱۔ ڈاکٹر تارا چند

"ہندوستانی" ہمارے دیس کی سب بولیوں میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا، کہ ہندوستان کے آدھے رہنے والوں کی زبان ہے۔ پنجاب، راجپوتانہ، دلّی، آگرہ، اودھ، بہار اور مہا کوشل میں تو ہندوستانی یا اس سے بہت ملتی جلتی بولیاں بچے اپنی ماؤں سے سیکھتے ہیں لیکن ان صوبوں سے باہر ہر ایک بڑے شہر میں اس کے سمجھنے والوں کی گنتی تو اور بڑی ہے۔ ہندوستانی کوئی من گھڑت بھاشا نہیں ہے۔ یہ وہی کھڑی بولی ہے جسے میرٹھ اور دلّی کے آس پاس کے رہنے والے بہت پرانے وقتوں سے بولتے چلے آئے ہیں۔ اس کے چاروں طرف اور اور بولیاں بولی جاتی تھیں۔ اتر میں پنجابی اور لہنڈا، پچھم میں راجستھانی، پورب میں برج بھاشا اور اس کے آگے اودھی، بندھیلی، بھوجپوری، مگدھی وغیرہ۔ جس زمانے میں راجپوتوں کے ونش ہندوستان میں راج کرتے تھے۔ ان بولیوں کا رواج بڑھ رہا تھا۔ پہلے پہل راجستھانی کا ستارا چمکا اور کویوں نے اس میں کوتائیں لکھیں۔ جب مسلمانوں نے ہندوستان فتح کیا اور دلّی کو راجدھانی بنایا تو ہندستانی کی قسمت پلٹی۔ دلّی کی انجان بولی تاکیوں کی زبان پر چڑھی۔ یہ اسے اپنے ساتھ گجرات اور دکن لے گئے۔ لشکروں، بازاروں اور خانقاہوں میں اسی کی دھن سنائی پڑنے لگی۔ سپاہی، دوکاندار اور صوفی درویش اسی میں بات چیت کرنے لگے۔ جب اس میں دھرم کا پرچار اور شہر کا روبار چلنے لگا۔ تو یہ راج درباروں میں پہنچی اور دکن کے سلطانوں کے ہاتھوں پروان چڑھی قصّے کہانیاں، غزلیں، قصیدے، مرثیے اور مذہبی نظمیں بھی ہندوستانی میں لکھی جانے لگیں۔ چاروں طرف اس کا ڈنکا بجا تو دلّی والوں کو بھی اپنی بھولی بسری بھاشا کی سدھ آئی اور مغل بادشاہوں اور ان کے درباریوں نے بڑے چاؤ سے اس کی آؤ بھگت کی۔ اب ہندوستانی کی دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہوئی۔ پھر دلّی میں آکر مغل دربار کی چھایا میں اس کا رنگ بدلا۔ بادشاہ، امیر اور عالم فارسی یا ترکی بولتے تھے۔ ان کے کان ہندوستانی کی آواز سے آشنا نہ تھے۔ اور ان کی زبانوں سے اس کے لفظوں کا ٹھیک ٹھیک ادا ہونا کٹھن تھا۔ انہوں نے دکن میں بنی ہوئی ہندوستانی کی کانٹ

www.taemeernews.com

چھانٹ شروع کی اور اُسے فارسی سے ملانے میں کوئی کسر نہ چھوڑیں۔

اس بیچ میں آتے آتے ہندوستان میں اپ بھرنشا کی جگہ برج بھاشا اور اودھی نے لی۔ سور، تلسی، بہاری، رحیم جیسے مہاکویوں نے ان بولیوں کو دھرتی سے آسمان پر پہنچایا۔ اور ان کے خزانوں کو انمول رتنوں سے بھر دیا۔ اٹھارویں صدی کے انت تک یہ حالت رہی کہ برج اور اودھی جیسی بھاشاؤں میں ایک طرف اردو فارسی ملی ہندوستانی یا اردو میں کو تا ہوتی رہی۔ دوسری طرف ہندوستان کی پراکرتو یا سنسکرت مدرسوں اور پاٹھ شالاؤں میں کی زبان بنی رہی۔ انگریزوں کا دیس پر قبضہ ہوا، انہوں نے فارسی کو سنگھاسن سے اتارا، انگریزی کو اس کی جگہ بٹھایا۔ عربی، فارسی اور سنسکرت کے پرانے ڈھرہ ل پر چلنے والوں کے لئے چھوڑ ہندوستانی سے نئی پود کے پڑھانے لکھانے کا کام لینے کا ارادہ کیا۔ اس میں کٹھنائی یہ تھی کہ اردو و برج اور اودھی میں کو تا تو بہت تھی۔ پر پڑھائی کی کتابیں کم۔ فورٹ ولیم کالج کے پرنسپل جان گلکرائسٹ نے اس کمی کو اس طرح پورا کیا کہ ہندوستان سے میرامن۔ افسوس۔ حیدری۔ کاظم علی جوان۔ ولا جیسے اردو کے اچھے اچھے لکھنے والوں کو کلکتے میں بلوایا اور ان سے نثر کی کتابیں لکھوائیں۔ انہوں نے پرانی کتابوں کو سامنے رکھ کر۔ باغ و بہار، آرائش محفل، توتا کہانی، بارہ ماسا، بیتال پچیسی وغیرہ لکھیں۔ ہندوؤں کے لیے للوجی لال۔ بدل مصرا، بینی نرائن وغیرہ کو حکم ملا کہ نثر (گدھ) کی کتابیں تیار کریں۔ انہیں اور بھی زیادہ مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ادب یا ساہتیہ کی بھاشا تو برج تھی۔ لیکن اس میں گدھ یا نثر نام کے لئے ہی تھا۔ کیا کرتے انہوں نے یہ راستہ نکالا کہ میرامن، افسوس وغیرہ کی زبانوں کو اپنایا۔ پر اس میں سے فارسی عربی کے لفظ چھانٹ دیئے اور سنسکرت اور ہندی کے رکھ دیئے اور پریم ساگر نامی، کیتو پاکھیان جیسی پوتھیاں تیار کیں۔ اس طرح دس برس سے بھی کم مدت میں دو نئی زبانیں اپنے اصلی گھرانے سے سیکڑوں کوس دور پردیسیوں کے اشارے سے بن سنور رنگ منچ پر آ کھڑی ہوئیں۔ دونوں کی صورت مورت ایک تھی۔ کیوں کہ دونوں ایک ہی ماں کی بیٹیاں تھیں۔ پھر دونوں کے سنگار، کپڑے اور زیور میں فرق نہ تھا۔ پر دونوں کے مکھڑے ایک دوسرے سے پھرے ہوئے تھے۔ اس ذرا سی بے رخی نے دیس کو دبدھا میں ڈال دیا اور اس دن سے آج تک ہم الگ الگ دو راہوں پر بھٹک رہے ہیں۔

سو برس گزر گئے۔ ہمارے جیون کے آکاش میں آندھیاں آئیں۔ بادل گرجے۔ بجلیاں چمکیں ہندوستان کو بلاؤں کا سامنا کرنا پڑا۔ بھوک، بیماری، جہالت کے دکھوں سے کڑھنا پڑا۔ دیس نے کروٹ بدلی۔ مدتوں کے بچھڑوں میں ملنے کی خواہش ہوئی۔ ہندوستان ہمارا گھر ہے۔ اس میں بہت سے کنبے رہتے ہیں۔ ان میں ابھی تک اَن مناپن ہے۔ کہیں کہیں بیر ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سب کنبوں کو ملا کر ایک بڑا خاندان بنائیں۔ سب کو ایک چھم کی چھایا میں اکٹھا کریں۔ سارے خاندان کی ایک بولی ہونی چاہیے۔ جس میں سب ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت کر سکیں۔ بھاشاؤں کی کھوج کرنے والوں کا کہنا ہے کہ بھاؤ ہی سے آدمی کی بولی کا جنم ہوا ہے۔ آدمی کے دل کو پریم نے گدگدایا تو اسے ظاہر کرنے کے لئے آوازوں نے لفظوں کی صورت لی۔ ہندوستان کو پریم کے رشتے میں باندھنے کے لئے ایک بولی چاہیے تھی وہ بولی کون سی ہو سکتی ہے۔ وہی جسے ہندوؤں کی پرانی راجدھانی دتی کے رہنے والے سدا بولتے آئے تھے۔ جسے مسلمانوں نے گمنامی کے پردے سے باہر نکالا تھا اور جسے ایسٹ انڈیا کمپنی نے انیسویں صدی کے شروع میں رواج دیا تھا۔ وہی جو آج ہندوستان کی جیبھ پر کھیلتی ہے اور ہمارے کانوں کو سہاتی ہے۔ اس بولی اور دوسرے صوبوں کی بولیوں میں کوئی کھینچ تان نہیں وہ ان کی جگہ لینے کی دعویدار نہیں۔ یہ سب مانتے ہیں کہ عام زبان کی حیثیت سے ہندوستانی ہی سرکاری اور دفتری زبان ہونی چاہیے اور

www.taemeernews.com

اس میں راج سبھاؤں کے ممبر ادر صوبوں کے نمائندے بحث کریں اسی کے ذریعے کانگریس اور ہندی مجلسوں کے بیٹھکوں کی کارروائی ہو، سرکاری حکم اور قانون چھپیں عام زبان ہونے کے علاوہ جن حصوں میں یہ بچوں کی ماں کی زبان ہے۔ وہاں اسی کے ذریعے تعلیم بھی ہو۔ نہ صرف چھوٹے درجوں میں بلکہ اونچے سے اونچے درجوں میں اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں میں۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہندستانی نہ اردو کے خلاف ہے اور نہ ہندی کی دروھی ہے۔ دونوں کے بیچ میں جو چوڑی کھائی بن گئی ہے اس پر پل تیار کرنا چاہتی ہے۔ جس پر ساری قوم ایک ساتھ آسانی سے چل سکے۔

اس دکھ دائی جھگڑے کو مٹانے کا ایک ہی اپائے ہے۔ ہندی اور اردو کے لکھنے والے ان خاص لفظوں کے لیے جنھیں پری بھاشک شبد یا اصطلاحیں کہتے ہیں ایک ہی لفظ مان لیں۔ حساب، سائنس، فلسفہ کلاسیکی کتابوں میں دونوں زبانوں میں چاہے ناگری میں چھپیں۔ چاہے عربی حروف میں یہ خاص لفظ ایک ہی رہیں۔ نوجوانوں، لڑکوں اور لڑکیوں کی پڑھائی کے لیے دونوں کی پری بھاشائیں ایک ہی ہونی چاہییں۔ یوں ہندی اور اردو کا قضیہ بہت حد تک مٹ جائے گا اور آئندہ کے سمجھوتے کی راہ نکل آئے گی۔ ایسے ہی ادب کی زبان، شعر و شاعری، کوتا، کہانی، ناول، قصے، تاریخ، اتہاس وغیرہ کی زبان میری رائے میں اس میں پوری آزادی ہونی چاہیے۔ جو چاہے جس ڈھنگ میں لکھے سب ہی زبانوں میں لکھنے کے کتنے ہی ڈھنگ ہوتے ہیں۔

میری رائے میں یہ نتیجہ کسی طرح برا نہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ہندی کو سنسکرت سے اور اردو کو عربی سے گوندھ دینا چاہتے ہیں۔ ان کے ٹکسال لفظوں کا سوال سمجھتا یا تہذیب کا سوال ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہندو تہذیب کے لئے سنسکرت اور مسلم سبھتا کے لئے عربی میں ڈوبی ہوئی بھاشا ہونی نہایت ضروری ہے۔ میری رائے میں یہ بڑی نادانی ہے۔ اس میں پہلی بھول تو یہ ہے کہ تہذیب کو زبان اور لفظ سے ملا دیا ہے۔ تہذیب کی اصلیت بھاؤ اور وچار ہے۔ وہ بھاؤ جن سے آدمی اپنے جیون کا ارتھ سمجھتے ہیں۔ جو انھیں سکھ کے راستے اور آنند کی منزل کا پتہ دیتے ہیں۔ وہ وچار جن کی چوڑی اور مضبوط نیو پہ سماج کا اونچا محل کھڑا ہوتا ہے۔ بھاؤ اور وچار وہ اصل سونا ہے جس کی ساکھ پر لفظوں اور زبانوں کے کاغذی نوٹ اور نمائشی سکے چلتے ہیں۔ لفظوں کی مہتا کو بڑھانا، سونے کو چھوڑ ٹھاٹ پر جی لگانا ہے۔ ہمارا دل اس دن کی راہ دیکھ رہا ہے جب ہندستان ہر پہلو سے ایک قوم ہوگی۔ بیر کی بیلیں کاٹی جائیں گی اور سب ہندستانی ایک دیس پریم کے ناتے میں بندھے ہوں گے۔" ہندستانی "اسی ایکتا کی جیتی جاگتی بولتی نشانی ہے۔"

اس سلسلے کی دوسری تقریر ڈاکٹر مولوی عبدالحق بابائے اردو کی ہے جو ۲۱ فروری ۱۹۳۹ء کو آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوئی:

۲- ڈاکٹر مولوی عبدالحق

"ہندستانی" کا لفظ آج کل بھڑوں کا چھتا بنا ہوا ہے۔ اب آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن نے اس چھتے کو چھیڑا ہے۔ تو اسے ڈنک سہنے کے لئے بھی تیار رہنا چاہیے۔ زبان کے معنوں میں ہندستانی کا لفظ ہمارے کسی مستند شاعر یا ادیب یا اہلِ زبان نے کبھی استعمال نہیں کیا۔ یہ یورپ والوں کی اپج ہے۔ یورپ کے سیاحوں نے جو سترھویں صدی سے اس ملک میں آنے شروع ہوتے۔ اس زبان کو جو شمالی ہند میں عام طور سے بولی جاتی تھی۔ اندستان، اندستانی اور بعد ازاں ہندستانی کے نام سے موسوم کیا لیکن اس لفظ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں اس وقت فروغ ہوا جب ۱۸۰۰ء میں کلکتے میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا۔ عجیب بات یہ ہے کہ کالج کے انگریز استاد نوائص زبان کو جس میں میر امن کی "باغ و بہار"، شیر علی افسوس کی "آرائشِ محفل"، حیدری کا "طوطی نامہ"

www.taemeernews.com

اور طپش کی بہار دانش وغیرہ لکھی گئیں ہندستانی کہتے ہیں لیکن ان کتابوں کے لکھنے والے اپنی کتابوں کی زبان کو اردوئے معلیٰ' ریختہ' یا ہندی کہتے ہیں۔ مثلاً میر امن نے اپنی کتاب 'باغ وبہار' یا 'قصہ چہار درویش' کو ایک عرضی کے ساتھ پیش کیا جس میں وہ لکھتے ہیں کہ اردوئے معلیٰ کی زبان میں باغ وبہار بنایا اسی عرضی کے آخر یہ شعر ہے ؎

سو اردو کی آراستہ کی زبان

کیا میں نے بنگالہ ہندوستان

اسی کتاب کے دیباچے میں زبان کی تاریخ بیان کرتے وقت لکھتے ہیں: "حقیقت اُردو زبان کی بزرگوں کے منہ سے یوں سنی' میر شیر علی افسوس 'آرائش محفل' میں لکھتے ہیں کہ "اس کے تمام مطالب کو اُردو زبان میں لکھنا شروع کیا"۔ مرزا طپش 'شمس البیان' میں اپنی زبان کو روزمرہ فصحائے اردوئے معلیٰ کہتے ہیں اور اپنی بہار دانش ہندی میں اس زبان کو ایک ہی شعر کے ایک مصرع میں 'ہندی زبان' اور دوسرے میں 'اُردو' لکھا ہے ؎

شرف اس نے ہندی زباں کو دیا

دیا نظمِ اُردو کو یہ مرتبا!

اور چند اشعار کے بعد اسے 'ریختہ' کہتے ہیں۔ ع

دقایق ہیں ہے ریختے کے تمام

حیدر بخش حیدری قصہ حاتم طائی کی زبان کو زبانِ ریختہ کہتا ہے۔ میر امن 'گنج خوبی' میں گلکرائسٹ کو اردو کا قدردان لکھتا ہے۔ مہر چند کھتری لاہوری اپنی کتاب 'نو آئین ہندی' میں لکھتا ہے کہ اس نے قصہ 'آذر شاہ' اور 'سمن رخ' کو فارسی سے ہندی میں ترجمہ کیا۔ ڈاکٹر جان گل کرائسٹ اپنی تصانیف میں 'ہندستانی' اور 'اردو' دونوں لفظ اسی ایک زبان کے لئے استعمال کرتا ہے۔ بابو شیو پرشاد نے بھی 'جام جہاں نما' کی زبان کو اردو بتایا ہے۔ کلکتہ بیپٹسٹ مشن نے جو انجیل مقدس کا ترجمہ چھاپا تھا اس کے سرورق پر لکھا ہے "یونانی زبان سے اردو زبان میں ترجمہ کیا گیا"۔ لیکن اس کے نیچے انگریزی زبان میں "ہندوستانی زبان میں" لکھا ہے بابو کاشی ناتھ لبواس کرانی اپنی کتاب 'قصہ سوسن مسمٰی بہ گلدستۂ انجمن' کے سرورق پر لکھتے ہیں "انگریزی زبان سے اُردو زبان میں ترجمہ کیا گیا"۔ ڈاکٹر ای۔ جی۔ لارنس 'رابن سن کروسو' کے ترجمے میں مسٹر جیمس کورکورن اپنی 'تاریخ چین' اور ڈاکٹر فریڈرک جان اپنی 'اصول تشریح' کی زبان اردو ہی کہتے ہیں اسی طرح دہلی کالج' علی گڈھ سائنٹفک سوسائٹی مرزاپور' میسیز کی جتنی کتابیں چھپیں ان سب پر اُردو ہی کا لفظ لکھا ہے۔

غرض وہ تمام کتابیں جن کے نام میں نے لئے ہیں۔ اسی زبان میں ہیں۔ جسے ہم آجکل اُردو کہتے ہیں۔ انگریز اسے ہندستانی کہتے تھے۔ ہندستانی سے ان کی مراد وہ صاف اور فصیح زبان تھی جو بول چال میں آتی ہے یعنی ایسی زبان جو مقفیٰ، مسجع اور پرتکلف نہ ہو جس کا رواج اس زمانے کی بعض کتابوں میں پایا جاتا تھا۔ اُردو۔ ریختہ۔ ہندی اس زمانے میں ہم معنی لفظ تھے۔ چنانچہ مرزا جان طپش نے اپنی کتاب "شمس البیان" میں ہندی کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے "ہندی عبارت از زبان موزونِ دہلی ست" یعنی ہندی سے

www.taemeernews.com

مراد دلّی کی فصیح زبان ہے۔ جدید ہندی جس کی اشاعت کی آجکل کوشش کی جا رہی ہے۔ نئے زمانے کی پیداوار ہے۔ اس نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں جنم لیا۔ دراصل یہ اُردو کا بچہ ہے وہ اس طرح کہ اُردو، عربی فارسی کے لفظ نکال کر ان کی جگہ سنسکرت کے لفظ بٹھا دیئے تھے۔ مختصر یہ کہ ہمارا اُدب ہندستانی کے لفظ سے خالی ہے۔ اردو کے مستند اہلِ زبان اور غالباً ہندی کے اہلِ زبان نے بھی اس لفظ کو زبان کے معنی میں کبھی استعمال نہیں کیا۔

جب اس زمانے میں ہندی اردو جھگڑے نے زور پکڑا۔ اور دونوں فریق ایک دوسرے کی مخالفت پر تُلے ہوئے تھے۔ تو انڈین نیشنل کانگریس نے رفع شر کے خیال سے ہندستانی کا لفظ اختیار کیا اور اسی کو ہندستان کی عام زبان قرار دیا لیکن کانگریس نے اس کی کوئی تعریف نہیں کی اور نہ یہ بتایا کہ اس سے کیا مطلب ہے، وہ شاید اس جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتی تھی اور یہ اچھا ہی ہوا۔ کیونکہ آج کل سیاسی لوگوں نے جہاں اور چیزوں کو سیاست میں سان لیا ہے۔ غریب زبان بھی ان کی نظرِ کرم کا شکار بن گئی ہے۔ اب سوچ بچار کے بعد ہندستانی کے یہ معنی قرار پائے ہیں کہ وہ زبان جو شمالی ہند میں عام طور سے بولی جاتی ہے اور جو ثقیل اور نامانوس سنسکرت اور عربی فارسی الفاظ سے پاک ہے۔ اصل میں ہندستانی کی یہ تعریف ڈاکٹر گریرسن کے بیان سے لی گئی ہے اور اس تعریف کو اکثر ان لوگوں نے قبول کر لیا ہے۔ جو ہندستانی کے حامی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ حقیقت میں یہ کوئی زبان ہے بھی۔ اگر اس سے مراد وہ زبان ہے جسے اٹھارویں اور انیسویں صدی کے انگریز ہندستانی کہتے تھے اور ہمارے اُس وقت کے ادیب ریختہ، ہندی اور اردو سے موسوم کرتے تھے تو بے شک یہ ایک زبان ہے اور اب بھی ہندستان میں بولی اور لکھی پڑھی جاتی ہے اور اس سے مراد وہ زبان ہے جو آجکل بعض جدت پسند حضرات نے گھڑنی اور ڈھالنی شروع کی ہے تو وہ ہمارے ملک کی زبان نہیں ہے اور اگر اس سے مراد وہ زبان لی جائے جو دونوں ہندی اردو بولنے والوں میں مقبول ہو تو وہ ابھی وجود میں نہیں آئی۔ بول چال کی زبان کی حد تک تو ٹھیک ہے۔ لیکن جہاں ادب کی سرحد آتی ہے۔ تو وہ رہ جاتی ہے۔ گاندھی جی نے ہندی ہندستانی کا لفظ ایجاد کیا تھا۔ چونکہ بے جوڑ تھا مقبول نہ ہوا۔ نتیجہ یہ کہ آسان اُردو کا نام ہندستانی ہوا۔ آپ فرمائیں گے کہ آسان ہندی کو ہندستانی کیوں نہ کہیں؟ ضرور کہیئے۔ کیوں کہ جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں جدید ہندی اُردو ہی کا تو بچہ ہے۔ رہی یہ بات کہ زبان سادہ اور آسان ہو تو بول چال میں تو عموماً سادہ ہی ہوتی ہے۔ یا جب چھوٹے یا معمولی پڑھے لکھوں کے لئے کوئی کتاب یا قصے کہانیاں لکھی جاتی ہیں تو بھی زبان سادہ رکھنی پڑتی ہے۔ یہ کچھ ہماری عادت ہی پر موقوف نہیں۔ دُنیا کی سب زبانوں کا یہی حال ہے۔ مگر جب کوئی اچھی نظم لکھنی ہوتی ہے۔ یا علمی یا ادبی بحث آپڑتی ہے تو سادہ زبان کا نبھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ محض زبان کا آسان ہونا کافی نہیں۔ اس میں جان، اثر اور لطف بھی ہونا چاہیے اور یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ایسی زبان صرف کامل ادیب ہی لکھ سکتے ہیں۔ ورنہ ایسی تحریر سے کیا فائدہ جو سپاٹ، بے مزہ اور بھدی ہو۔ دوسرے ہر ایک کا طرزِ تحریر الگ ہوتا ہے کسی کا کوئی رنگ اور کسی کا کوئی ڈھنگ۔ ہر ایک کے مزاج اور افتادِ طبیعت پر منحصر ہے۔ ہم کسی کو مجبور نہیں کر سکتے کہ یوں نہیں یوں لکھو۔ اگر مجبور کریں بھی تو ممکن نہیں وہ نیا ڈھنگ تو کیا اختیار کرے گا۔ اپنا بھی بھول جائے گا۔ میرے کہنے کا منشا یہ ہے کہ یہ جو آج کل چاروں طرف آسان، آسان کا پرچار کیا جا رہا ہے۔ مجھے تو یہ کچھ بے جا سا معلوم ہوتا ہے۔ لفظ کوئی بے جان چیز تو ہے نہیں۔ جہاں چاہا اٹھایا رکھ دیا۔ اس کے گنوں کو پرکھنے والے مشاق ادیب ہی ہو سکتے ہیں۔ کسی اعلیٰ درجے کے ادیب یا شاعر کا کلام اٹھا کر دیکھئے۔ بہ دقت یہ معلوم ہوگا

www.taemeernews.com

ہے کہ نگینہ ہے جو اپنی جگہ جڑا ہوا ہے۔ اسے بدل کر کوئی دوسرا لفظ رکھ دیجئے۔ ساری لطافت اور نزاکت خاک میں مل جائیگی۔ علاوہ اس کے آسان اور مشکل اضافی الفاظ ہیں یعنی ایک چیز جو مجھے مشکل معلوم ہوتی ہے۔ دوسرا اُسے آسان سمجھتا ہے۔ جسے میں آسان سمجھتا ہوں وہ دوسرے کے نزدیک مشکل ہے۔ اس سے آسان اور مشکل کی کوئی حد مقرر نہیں ہو سکتی۔ یہ ذوق کی بات ہے اور ادب میں یہی منزل بڑی کٹھن ہے۔ وہاں آسان اور مشکل کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا۔ وہاں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ لفظ موقع اور محل کے مناسب ہے یا نہیں۔ اگر آسان لفظ بھی بے محل آگیا۔ تو ایسا برا ہے جیسا بے موقع مشکل لفظ۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بیان پیچیدہ اور الجھا ہوا نہ ہو۔ سادگی اور آسانی کے یہی ایک معنی ہو سکتے ہیں۔

گاندھی جی بابو راجندر پرشاد اور ان کے ساتھیوں نے اس بات کا اعلان کیا ہے کہ ہندی یا ہندوستانی میں سنسکرت ملانے کی اس لئے ضرورت ہے کہ اُسے بنگال اور جنوبی ہند کے لوگ سمجھ سکیں ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ جب بنگال اور جنوبی ہند میں جائیں تو ایسی سنسکرت ملی زبان میں بات چیت یا تقریر کریں اور جب صوبہ سرحد اور پنجاب میں جائیں تو فارسی عربی ملی زبان میں، تو ایسی صورت میں ہندستان کی ایک مشترک زبان کہاں رہی۔ جس کے لئے یہ سب جتن کئے جا رہے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ اس سنسکرت ملی زبان ہی کی وجہ سے جنوبی ہند والے ہندی یا ہندستانی کی سخت مخالفت کر رہے ہیں۔ ان کو یہ بدگمانی ہے کہ ہندی کے حیلے سے سنسکرت زبان پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور ہم ان کی زبان اور کلچر کو مٹانا چاہتے ہیں۔

ہماری زبان اگر زندہ زبان ہے تو اس میں نئے نئے الفاظ آتے ہی رہیں گے۔ خواہ وہ کسی زبان کے ہوں۔ اس سے کوئی زندہ زبان نہیں بچ سکتی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جو لفظ مدت سے رائج چلے آ رہے ہیں۔ انھیں خارج کر دیں اور ان کی جگہ ڈکشنریوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے بے ڈول، بے ڈھنگے اور کرخت لفظ داخل کر دیں۔ جس کے ادا کرنے میں زبان کئی کئی قلا بازیاں کھائے اور کانوں کے پردے پھٹنے لگیں۔ جو لفظ پہلے سے رائج ہیں اور ہماری زبان میں گھل مل گئے ہیں۔ خواہ وہ کسی زبان کے ہوں وہ اب ہمارے ہیں، غیر نہیں۔ انھیں غیر سمجھ کر نکالنا سراسر حماقت ہے۔ ایسا جو کرتے ہیں وہ اپنی زبان کے دوست نہیں دشمن ہیں۔ نئے لفظوں کے داخلے میں بھی زبان کی فطرت اور ذوق کو بڑا دخل ہے۔ اندھا دھند اور زبردستی لفظ داخل نہیں کئے جا سکتے۔ جو بندھ گیا سو موتی۔ جو کھپ گیا وہ ہمارا اور جو نہیں کھپا وہ سو غیروں کا غیر۔

بہار گورنمنٹ نے ہندستانی کمیٹی بنائی ہے۔ ہندستانی زبان کی گریمر، لغت اور مدرسوں کے لیے ریڈرس لکھوانی تجویز کی ہیں۔ ابتدائی جماعتوں کے لیے ریڈرس اس زبان میں لکھنا تو کچھ مشکل نہ ہو گا۔ لیکن اونچے درجوں کے لیے جہاں زبان کی ادبی شان بھی رکھنا ضروری ہوتی ہے۔ کتابیں لکھنے میں مشکل پڑے گی۔ اس سے زیادہ مشکل اصطلاحات کے بنانے میں ہو گی۔ اس کا انتظار کرنا چاہیے۔ اگر اس نے بیچ کا کوئی راستہ نکال لیا جو مقبول ہو سکے تو یہ اس کی بڑی جیت ہو گی، کم سے کم آپس کی بات چیت اور کاروبار کے لئے کار آمد ہو گی۔ اس کے بعد اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ ہندستانی زبان کسے کہتے ہیں تو میں اس کے جواب میں کہوں گا کہ جس زبان میں میں نے آج تقریر کی ہے۔ یہی ہندستانی ہے۔ ہماری تنقید کے لیے دو جملے دیئے گئے ہیں۔ ایک جملہ یہ ہے:

'فیڈرل لیجس لیچر کے لیے فہرست رائے دہندگان تیار کرنے کے سلسلے میں جو ابتدائی کارروائی کی جائے گی۔ اس کے

www.taemeernews.com

بارے میں سرایٔن این سرکار لا ممبر نے آج اسمبلی میں روشنی ڈالی۔" اس جملے میں اگر فیڈرل فیجیں لیجر، لا ممبر اور اسمبلی کے لیے انگریزی لفظ استعمال کیے گئے ہیں۔ لیکن جملے کا مطلب صاف سمجھ میں آتا ہے۔ "روشنی ڈالنا" انگریزی محاورہ کا ترجمہ ہے۔ لیکن اب روشنی ڈالنا اور روشنی پڑنا، اردو میں استعمال ہونے لگے ہیں اور ان کا مفہوم کسی دوسرے محاورے سے اس خوبی سے ادا نہیں ہوتا۔ جس طرح پہلے فارسی محاوروں کے ترجمے ہماری زبان میں داخل ہو گئے ہیں۔ اب بعض انگریزی محاوروں کے ترجمے داخل ہو رہے ہیں۔ یہ کوئی عیب کی بات نہیں بشرطیکہ زبان میں کھپ جائیں۔ اس سے زبان میں وسعت ہوتی ہے۔ دوسرا جملہ یہ ہے" سنکٹ پراتیہ دیو ستھاپکا پریشد میں ایک پرشن کا اتر دیتے ہوئے نیائے منتری ڈاکٹر کاٹجو نے ان ادیوگ دھندوں کی سوچی دی۔ جن کی انتی کے لئے سرکار نے سہاتا دینا سویکار کیا ہے۔" اس جملے میں سنسکرت لفظوں کی بھرمار ہے اور مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ ہماری زبان نہیں۔ یہ سراسر بناوٹی زبان ہے۔" تیسری تقریر بابو راجندر پرشاد سابق صدر جمہوریہ ہند کی ہے۔ یہ تقریر ۲۲ فروری ۱۹۳۹ء کو نشر ہوئی تھی۔

۳۔ ڈاکٹر بابو راجندر پرشاد

"ہندستانی" اس بولی کو کہتے ہیں۔ جس کو تر ہندستان کے سب رہنے والے چاہے وہ ہندو ہیں یا مسلمان سمجھتے ہیں۔ یہ ناگری اور فارسی دونوں اکچھروں میں لکھی جاتی ہے۔ کانگریس نے اسی کو سارے ہندستان کے لئے قومی زبان یا راشٹر بھاشا مان لیا ہے اور جہاں کے لوگ اسے سمجھ نہیں سکتے ہیں۔ وہاں اس کو پھیلانے کی کوشش کی جاری ہے۔ اس لئے اس کی عزت اور بڑھ گئی ہے اور اس کی شکل کیا ہونی چاہیے۔ اس پر بھی بہت چرچا ہونے لگا ہے۔ ہندستانی کے دو روپ کہے جا سکتے ہیں۔ ایک جس کا نام ہندی ہے اس میں سنسکرت کے شبد بہت آتے ہیں۔ دوسرا وہ جس میں اسی طرح فارسی اور عربی کے لفظ بہت آتے ہیں۔ دیاکرن ایک ہونے پر بھی دونوں کے لکھنے میں فرق پڑ گیا ہے اور وہ بڑھتا جا رہا ہے۔ جو سنسکرت کے شبد آتے ہیں ان کا کہیں کہیں ہندی کے دیاکرن کے مطابق دیوہار کر کے سنسکرت دیاکرن کے بھی مطابق دیوہار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح فارسی اور عربی کے لفظوں کو عربی اور فارسی کا جامہ کہیں کہیں پہنایا جاتا ہے۔ کچھ کٹر لکھنے والے یا بولنے والے اگر وہ ہندی کے پریمی ہیں تو فارسی اور عربی کے لفظوں کو اور اگر وہ اردو کے حامی ہیں تو سنسکرت کے شبدوں کو چن چن کر اپنے لیکھوں سے نکال دیتے ہیں اور سنسکرت فارسی یا عربی کے لفظوں کا ہی استعمال کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہندی اور اُردو ایک دوسرے سے الگ بھاگتی جا رہی ہیں۔ ہندستانی بیچ کا راستہ لیتی ہے۔ وہ نہ تو سنسکرت کے شبدوں دھتکار کرتی ہے اور نہ فارسی عربی کے لفظوں کو خارج کرتی ہے۔ اس کا اپنا دیاکرن ہے۔ جس کو وہ ہمیشہ کام میں لاتی ہے اور سنسکرت یا فارسی عربی کے قاعدے سے کام نہیں لیتی ہے۔ اگر ان کے کسی شبد کو لیتی ہے تو اس کو اپنا جامہ پہناتی ہے اور اپنے میں ملا لیتی ہے۔

[اس کے بعد وہ دونوں جملے جو مشتہر کئے گئے زیر بحث آئے ہیں اور اس سے
اُردو اور ہندستانی کا فرق بتایا ہے]

اس میں جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ دیاکرن تو ہندستانی ہی کا استعمال ہوا ہے۔ مگر شبد آئے ہیں وہ سنسکرت کے ہیں اور ایسا معلوم پڑتا ہے کہ جیسے فارسی عربی کے لفظ جان بوجھ کر نکالے گئے ہیں 'پرشن' اور 'اتر' 'سوچی' اور 'سہاتیا' سنسکرت کے شبد ہیں۔ فارسی اور عربی سے لئے گئے سوال جواب فہرست اور مدد کچھ کم چالو نہیں ہیں۔ ادیوگ دھندوں کے بدلے میں صرف دھندا کافی ہو سکتا ہے۔ ہندستانی میں کسی

www.taemeernews.com

شبد کا دہشکار نہیں ہے۔ چاہے وہ کسی بھی بھاشا کا ہو لے لیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جیسا کہ اوپر دکھلایا گیا ہے۔ انگریزی کے لفظ لئے گئے ہیں۔ پہلی مثال میں فیڈرل لیجس لیچر جوں کا توں رکھا گیا ہے۔ دوسری میں لیجس لیٹو اسمبلی کا انتھا دیوا نیکا پرشد سے کیا گیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس جھگڑے کا نبٹارا ایک طرح سے ہو سکتا ہے کہ جتنے عربی فارسی کے لفظوں کو ہندی کے اچھے لکھنے والوں نے استعمال کیا ہے اور جتنے سنسکرت کے شبدوں کو اچھے اردو لکھنے والوں نے دیوہار کیا ہے۔ ان کو ہندستانی میں لے لینا چاہیے اور ان کے علاوہ بھی نئے لفظوں کا دہشکار اس لئے ہی نہیں ہونا چاہیے کہ وہ کسی خاص زبان سے لئے گئے ہیں بلکہ اس میں یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ کہاں تک جلد لوگوں میں چل گئے ہیں یا چل جائیں گے۔ اگر وہ آسانی سے لوگوں کی سمجھ میں آجاتے ہیں تو ان کو نکالنا ہندستانی کو کمزور بنانا ہوگا۔ آجکل بہت سے نئے لفظ گھڑنے ہوں گے۔ کیونکہ نئے وچار پھیل رہے ہیں۔ نئے معنی سامنے آرہے ہیں۔ جن کے لئے ہندی اور اردو میں بھی لفظ نہیں ہیں۔ ان کے لئے لفظ سنسکرت یا عربی فارسی سے ہی بنائے جا سکتے ہیں۔ اس میں یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ آسانی سے بولے اور سمجھے جا سکتے ہیں یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کہیں کہیں انگریزی کے شبد ہم کو رکھ لینا پڑیں۔ اس سے ہماری ہندستانی کمزور نہیں ہوگی مگر ہم کو اپنے ویاکرن کو نہیں چھوڑنا چاہئے۔ سٹیشن شبد لینا ہی ہے۔ تو اس کا بہو وچن "سٹیشنز" نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ سٹیشنوں یا سٹیشنیں ہی ہونا چاہئے۔ درائے دہندگان کے بدلے رائے دینے والے کہیں اچھا ہے اور رائے دہندگان تو کسی حالت میں نہیں ماننا چاہیے۔ اگر رائے دہندہ لیا بھی جائے تو اس کا بہو وچن (جمع) رائے دہندوں سے ہونا چاہئے۔

اونچے درجے کے ساہتیہ کے لئے جو بھاشا ہوتی ہے۔ وہ معمولی بول چال کی بھاشا سے الگ ہو جاتی ہے۔ اس لئے ہندی اور اردو کا ساہتیہ ویاکرن ایک ہونے پر بھی الگ ہوا ہے اور ہوتا جاتا ہے جس نے سنسکرت پڑھی ہے یا سنسکرت بھری ہندی پڑھی ہے۔ وہ اسی طرح کی ہندی زیادہ لکھے گا۔ جس میں سنسکرت زیادہ ہو۔ جس نے فارسی عربی زیادہ پڑھی ہے۔ اس کی بھاشا میں فارسی عربی کے لفظ زیادہ آویں گے۔ یہ تو سوابھاوک یا قدرتی بات ہے۔ اس لئے اس بھاؤ کو روکنا مشکل ہے۔ تو بھی ہندستانی جو سب لوگوں کی زبان بننے کا دعویٰ کرتی ہے۔ اپنے کو ایسے روپ میں ہی رکھنے کی کوشش کرے گی۔ جس میں اس کو سب ہی جان پہچان سکیں اور اگر چاہیں تو اس کی کچھ سیوا اور خدمت کر سکیں۔ ہندستانی کو ہم کوئی نئی بھاشا یا نئی زبان نہیں جانتے اور نہ یہ جانتے ہیں کہ ہندی یا اردو سے کوئی الگ چیز ہے۔ ہندستانی بیچ کا راستہ لیتی ہے یہی کوشش کرتی ہے کہ ایسے لفظ آتے جائیں جو لوگوں میں سہل میں پھیلائے جا سکیں۔ میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ گاؤں کی بولیوں میں بھی بہت معنی دار لفظ ہیں جن کا ارتھ ادا کرنے والا ہندی اور اردو کا کوئی لفظ جلد نہیں ملتا۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو گاؤں میں ہی استعمال میں آتی ہیں اور ان کے نام بھی دیہاتی بولی میں ہیں۔ ہم اکثر ایسا دیکھتے ہیں کہ پڑھے لکھے لوگ ایسے لفظوں کا استعمال کرنا دیہاتی پن جانتے ہیں اور ان کے بدلے میں بھدے سنسکرت یا فارسی عربی کے لفظ ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ جو صرف ترجمہ ہوتے ہیں۔ ہندستانی کو چند لکھے پڑھے لوگوں کی ہی زبان نہیں رہنا ہے۔ اگر اسے گاؤں کے ان پڑھوں تک پہنچنا ہے اور اگر وہ کیول محلوں کی زبان نہ رہ کر جھونپڑوں تک پہنچنا چاہتی ہے تو اس کو سنسکرت عربی اور فارسی کے ہاتھوں پر سے اتر کر گھروں کی بولی کے پیروں پہ پیادے چلنا ہوگا۔

اس لئے میری سمجھ میں ایک ایسا لغت یا کوشن بننا چاہیے۔ جس میں ہندی چالو سنسکرت اور عربی فارسی کے لفظوں کے معنی دیئے ہوں۔ سکولوں اور کالجوں کے لئے قریب دو تین ہزار ایسے معمولی لفظ دونوں سے لئے جائیں جو بہت چل گئے ہیں اور جن کا جاننا بہت ضروری

www.taemeernews.com

ہو گیا ہے۔ مثال کے لئے دو لفظ جیسے جو بہت پر چلت ہیں۔ کار یہ کاری، سمت اور مجلس عاملہ دونوں کے معنی ایک ہیں۔ ایک ہندی اور دوسرا اردو کے اخباروں میں روزانہ آتا ہے۔ سب کے لیے دونوں کا جاننا ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ دنوں کے بعد دونوں معنوں میں کچھ باریک فرق پڑ جائے۔ تب زبان زیادہ دھنی ہو جائے گی اور اس باریکی کو ظاہر کرنے کے لیے اس کے پاس دو لفظ ہو جائیں گے۔ اسی طریقے سے ہم آج کے جھگڑے کو کم کر سکتے ہیں اور راشٹر بھاشا کی بھی اُنتی کر سکتے ہیں۔"

بابو راجندر پرشاد کی تقریر کے اقتباس کے بعد اس سلسلے کی چوتھی تقریر ڈاکٹر ذاکر حسین سابق صدر جمہوریۂ ہند کی ہے۔ جس کے ضروری حصے اقتباس میں لیے جاتے ہیں۔ یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو سے ۲۳ فروری ۱۹۳۹ء کو نشر کی گئی تھی۔

۴۔ ڈاکٹر ذاکر حسین

"مولیئر کے ایک ڈرامے میں ایک صاحب ہیں۔ موسیو ژوردیں "نثر" یہ نہ جانتے تھے۔ کہ کسے کہتے ہیں۔ جب کسی نے بتایا کہ آپ جو بولتے ہیں۔ یہی نثر ہے۔ تو انھیں بڑا ہی اچنبھا ہوا کہ چالیس برس سے بولتا ہوں اور یہ خبر نہیں کہ یہی نثر ہے۔ بار بار پوچھتے تھے کہ "یہی جو میں کہتا ہوں کہ ذرا میری جوتیاں ادھر دے دینا اور ذرا میرے رات کے کپڑے اٹھا دینا۔ یہی نثر ہے "نثر!" مگر کیا کیجئے کہ یہی ہے نثر" اسی طرح لوگ یہ نہیں جانتے کہ ہندوستانی کیا ہے؟ اردو ہندی ہندوستانی کا جھگڑا کچھ اس ڈھنگ سے چل رہا ہے اور لوگ اس کے سلجھانے میں وہ رہ الجھاؤ ڈال رہے ہیں۔ کہ سیدھی سادی بات کھٹائی میں پڑ گئی ہے۔ ڈرتا ہوں کہ اس سوال کا سیدھا سادہ جواب دوں تو لوگ موسیو ژوردیں کی طرح اچنبھے میں نہ پڑ جائیں۔ مگر کیجئے کیا کہ بات ہے سیدھی سادی۔

ہندوستانی بس وہ زبان ہے جس میں اس وقت میں آپ سے باتیں کر رہا ہوں۔ اور جسے آپ سمجھ رہے ہیں۔ آپ کی طرح اور میری طرح ہزاروں لاکھوں نہیں ہمارے دیس کے کروڑوں بسنے والے ہندو مسلمان اسے بولتے اور سمجھتے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں عام طور پر یہی بولی سمجھی جاتی ہے۔ پھر سارے ہندوستان میں اس کے بولنے سمجھنے والے پھیلے ہوئے ہیں بہت سے لوگ جو اسے بولتے نہیں تو سمجھتے ہیں۔ شہروں میں اس کا اور بھی چلن ہے۔ کسی بڑے شہر میں چلے جائیے اس کے بولنے والے اور اس سے زیادہ سمجھنے والے مل جائیں گے۔

میری یہ بات سن کر کہ ہندوستانی وہ ہے جو میں آپ سے بول رہا ہوں۔ شاید کوئی صاحب بول اٹھیں کہ آپ جو بول رہے ہیں یہ تو اردو ہے۔ میں کہوں گا کہ آپ سچ فرماتے ہیں۔ ہندوستانی اُردو بھی ہوتی ہے۔ اچھی ہندوستانی کی پہچان ہی یہی ہے کہ اُردو والا اس میں نہ عیب نکال سکے نہ ہندی والا اس پر کہیں انگلی دھر سکے۔ زبان کی پرکھ میں ہمارے مولوی عبدالحق صاحب کا مرتبہ سب ہی جانتے ہیں۔ انہوں نے انشاء اللہ خان کی "رانی کیتکی" پر جو دیباچہ لکھا ہے۔ اس میں باتوں باتوں میں ہندوستانی کی کیا اچھی پہچان بتا دی ہے فرماتے ہیں: "اسے اُردو والا بھی سمجھتا ہے اور ہندی والا بھی۔ زبان اور بیان دونوں صاف ہیں اسی کا نام ہندوستانی ہے۔ مگر رانی کیتکی' کی کہانی میں تو انشاء اللہ خان نے فارسی عربی کا ایک لفظ نہیں برتا ہے اور آپ تو اتنی دیر میں کوئی دس بیس لفظ عربی فارسی کے بول چکے ہم آمنے سامنے ہوتے تو آپ میں سے کوئی صاحب ضرور یہ فرما دیتے اور ٹھیک فرماتے۔ ہاں! میں نے عربی فارسی کے لفظ بولے اور اس لئے بولے کہ میں ہندوستانی بول رہا ہوں اور ہندوستانی میں عربی فارسی کے بہتیرے لفظ ہیں۔ سنسکرت کے لفظ بھی ہیں، پرتگیزی لفظ بھی ہیں، انگریزی لفظ بھی ہیں

www.taemeernews.com

اور نہ جانے اور کس کس زبان کے لفظ اس میں موجود ہوں گے۔ جو پنڈت لفظوں کے جنم پترے پڑھا کرتے ہیں۔ وہ کھوج لگایا کریں۔ یہ لفظ کہاں کا ہے۔ اور وہ لفظ کہاں کا۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ یہ میری زبان کے لفظ ہیں جنہیں اٹھتے بیٹھتے بولتا ہوں اور جن سے بولتا ہوں —— وہ انھیں سمجھتے ہیں اور ایسے سمجھنے والے دس بیس نہیں کروڑوں ہیں۔ لیکن وہ صاحب جو مجھ سے الجھ بیٹھے ہیں۔ فرمائیں گے کہ صاحب ہمیں یہ کھچڑی ذرا نہیں بھاتی۔ یہ بھلا کیا بات ہوئی کہ کچھ یہاں کی کچھ وہاں کی، نہ پورا تیتر نہ پورا بٹیر۔ زبان تو بس اپنی ہی ہونی چاہیئے۔ سودیشی۔ شدھ عبارت ہے۔ ایک اخبار نے انگریزی کی ایک خبر کا ترجمہ کیا۔

[یہ ترجمہ وہی تراشہ ہے جو مشتہر کیا گیا تھا۔ ہندی نما سنسکرت اور اُردو کا]

پھر میرے فرضی دوست مجھے ایک دوسرے اخبار سے یہ عبارت سنا دیتے "فیڈرل لیجس کے لیے فہرست رائے دہندگان تیار کرنے کے سلسلے میں این این سرکار لا ممبر نے آج اسمبلی میں روشنی ڈالی"۔ کہیے یہ ہے ہندستانی؟ میں کہتا ہوں کہ یہ ہے میری ہندستانی لکھنے والے کا دل تو صاف ہے یہ اشدھ اور شدھ کے چکر میں نہیں ہے۔ مگر اسے لکھنا نہیں آتا اور وہ اپنے کام کا پورا دھیان نہیں دیتا اس لیے پورا جملہ بے ڈھنگا ہے۔ فہرست رائے دہندگان ہندستانی نہیں۔ اسے ہونا چاہیے تھا۔ رائے دینے والوں کی فہرست۔ بارے میں روشنی ڈالنا بھی ایک انگریزی محاورے کا بہت ڈھیلا ترجمہ ہے۔ کسی چیز پر روشنی ڈالنا تو ہندستانی میں چل گیا۔ مگر 'بارے میں روشنی ڈالنا' مجھے ٹھیک نہیں لگتا نہ INDICATE کے لئے روشنی ڈالنا ضروری ہے "بتایا" دونوں ترجموں میں یہ برائی بھی ہے کہ مکھی پر مکھی مارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ترجمہ کرنے میں مطلب سمجھنا بہت ضروری ہے۔ یہ نہ ضروری ہے نہ ممکن کہ جملے کی بناوٹ وہی ہو جو انگریزی جملے کی ہے اور ہر لفظ کی جگہ لفظ آ جائے۔ خیر یہ بات تو بیچ میں آ گئی۔ ہم کہہ رہے تھے کہ زبان سودیشی ہو اور شدھ، تو میں آپ کو سچ سچ بتاؤں کہ زبان کو شدھ بنانے کی اس کوشش نے ہی ہندی اردو کا جھگڑا چھیڑا ہے۔ نہیں تو پہلے لوگ اردو ہندی کا فرق بھی نہ جانتے تھے۔ اُردو کے اچھے اچھے لکھنے والوں نے اپنی زبان کو ہندی بتایا ہے۔ وہ تو جب سے اس ملی جلی زبان میں سے عربی فارسی کے لفظوں کو نکال نکال کر سنسکرت لفظ لکھے جانے لگے تو وہ الگ الگ زبانیں بننے لگیں۔ ہندی والے شدھ ہندی لکھنے لگے اُردو والے عربی فارسی کے بے جوڑ لفظ بھی زبان میں لانے لگے۔ مگر اردو والے پورا پورا جواب دیتے تو کیسے دیتے وہ دو دن کی لڑائی میں اپنا صدیوں کا کام کیسے مٹا دیں۔ انہوں نے اپنی زبان کے لئے ہندستانی ڈھانچا اپنایا ہے۔ ہندستانی گرامر پر چلتے ہیں لفظوں کا دیس اور نسل اور مذہب دیکھ کر ان سے گھننا انھیں نہیں آتا۔ پھر بھی نہ جانے غصے میں یا یُوں ان کے کچھ لکھنے والے بھی جوڑ بے جوڑ عربی فارسی کے لفظ لکھ مارتے ہیں۔ اگر کتابوں کی زبان کو بول چال کی زبان کے نزدیک رکھا جائے تو وہ صاف اور سادہ بھی رہے۔ سمجھ میں آ سکے۔ اس میں زیادہ زندگی ہو۔ دل سے نکلے دل میں گھر کرے۔ نہ روز کے برتاؤ کے لفظ اس سے نکالے جائیں نہ ان مل بے جوڑ اس میں ٹھونسے جائیں۔ یہی ہندستانی ہے۔ لیکن زبان کو شدھ کرنے کی یہ کوشش جس سے اُردو ہندی کا جھگڑا نکلا آخر کیوں کی جا رہی ہے؟ اسے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس میں کوئی غلطی ہو تو جتانی چاہیے۔ شاید یہ اس لئے ہو کہ جب قوموں کو اپنے آپے کا دھیان ہو چلتا ہے۔ تو وہ ہر ہر چیز میں چاہتی ہیں کہ ان کی اپنی ہو اور پرایا اس میں کچھ نہ رہے۔ کچھ پرائی چیزوں سے انھیں دکھ

پہنچتا ہے۔ اس لئے وہ ہر چیز سے، جس پر پرائی ہونے کا ذرا بھی شبہ ہو سکے۔ بے زار ہوتی ہیں۔ جلدی میں وہ یہ نہیں سوچتیں کہ کچھ پرائے اپنے ہو چکے اور کچھ پرائے ہی ہیں۔ کچھ پرائی چیزوں سے زندگی تنگ ہوتی ہے۔ کچھ پرائی چیزوں نے زندگی کو آگے بڑھایا ہے۔ جو لوگ ہندوستانی زبان سے عربی فارسی کے بول چن چن کر نکالنا چاہتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ہندو مسلمانوں کے صدیوں کے میل جول سے جو چیزیں بنی ہیں۔ وہ پاک نہیں۔ ان میں سے پردیسی میل کچیل نکال باہر کرنا چاہیئے۔ شاید وہ جانتے نہیں کہ یہ میل کچیل ہماری زندگی کے رونگٹے رونگٹے میں بھد گیا ہے۔ انھیں اردو ہی میں سے عربی لفظ نکالنے نہ ہوں گے تلسی داس اور سور داس اور کبیر داس کی زبان کو بھی شدھ کرنا ہوگا۔ یہ ایسی ہی کوشش ہوگی۔ جیسے کوئی سر پھرا گنگا جمنا کے سنگم پر کھڑا ہو کر انھیں ایک دوسرے سے الگ کرنا چاہے۔ اور یہ کوشش یہیں رکے گی کیوں؟ پھر ہر چھوٹی چھوٹی ٹولی کا دیس بھی الگ ہوگا۔ زبان بھی الگ الگ ہوگی۔ راجدھانی بھی الگ۔ پردیسی لفظوں کو نکالنے کی کوشش کے بعد دوسری غلط بات جس سے ہندوستانی کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ یہ ہے کہ کبھی کبھی یہ کوشش کی جاتی ہے کہ جو لفظ دوسری زبانوں سے ہماری زبان میں آ تو گئے پر ذرا روپ بدل کر آئے ہیں۔ ان کے معنی کچھ بدل گئے ہیں" بولنے کا ڈھنگ بھی کچھ بدلا ہوا ہے۔ انھیں اپنی پرانی حالت پر پہنچا دیا جائے۔ وہی آنکھوں کو چہرے پر سے ہٹا کر گردن میں لگانے کی فکر۔ یہ کوشش بھی کتابی اور علمی لوگوں کی کوشش ہے جو بول چال کی زبان سے اور آدمیوں کی ریل پیل سے دور بیٹھے بیٹھے باتیں بگھارا کرتے ہیں۔ وہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ ہیرے جواہر کی طرح زبان کے بول بھی کٹتے چھلتے رہتے ہیں۔ زبانوں پر رُل مل کر ڈھلتے ہیں۔ اس سے ان کا بھدا پن دور ہوتا ہے۔ سڈول پن آتا ہے۔ صدیوں کے اس کام کو کسی عالم یا ودوان کی خاطر نہیں مٹایا جا سکتا۔ ہماری زبان میں جو لفظ آ گئے۔ سو آ گئے اور جس شکل میں بولے جاتے ہیں اسی شکل میں ہماری ہندوستانی زبان کے لفظ ہیں اور ان کے معنی وہی ہیں جو ہم ہندوستانی بولنے والے سمجھتے ہیں کبھی یا کہیں اور کیسے بولے جاتے ہیں اور کس معنی میں برتے جاتے ہیں اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ جو لفظ اب ہماری زبان میں رچ بس گئے ہیں وہ چاہے کہیں سے ہوں۔ سب اس ہندوستانی برادری میں بھائی بھائی ہیں اور جس شکل میں ہیں اسی میں ہمارے ہیں۔

دنیا روز آگے بڑھ رہی ہے۔ نت نئی چیزیں بن رہی ہیں۔ نت نئی باتیں کہی ہوتی ہیں۔ نئے نئے خیالات پھیلتے ہیں۔ ان نئی چیزوں، نئے خیالوں کے لئے نئے لفظ چاہئیں۔ کیا ہم ٹھان لیں کہ ہم جو لفظ برت رہے ہیں۔ بس انھی سے کام چلائیں۔ انھی کو ادھر پھیر کر نئی باتیں کہنے کی کوشش کریں۔ یا نئے لفظ گھڑ لیں یا اور کسی سے ادھار لیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ زبان کو بند کر دینے کا حق کسی کو نہیں۔ باتیں کہنی ہوں گی۔ تو نئے لفظ چاہیے ہی ہوں گے۔ مگر یہ لفظ کہاں سے آئیں؟ میرا کہنا یہ ہے کہ جہاں سے آئیں پر ایسے تک، ان مل بے جوڑ نہ ہوں۔ پہلے ہم کو اپنے گاؤں کی بولی میں ان کو ڈھونڈنا چاہیے۔ گاؤں والے قدرت سے بھی بہت قریب ہیں اور کتاب والوں کی طرح قدرت اور زندگی کے دھارے سے الگ کنارے پر کھڑے باتیں نہیں بنایا کرتے، ان کے یہاں بہت کچھ ملے گا۔ پھر کاریگروں اور کام کاج کے لفظ بڑی مدد دیں گے کتابی لوگ جن چیزوں کے لئے سنسکرت اور عربی لغت دیکھتے پھرتے ہیں۔ ان کے لئے یہاں ایسے نام مل جائیں گے جو نہ جانے کب سے برتے جا رہے ہیں۔ کل پرزوں کے لئے ایسے نام مل جائیں جو نئی چیز پر ٹھیک چپک جائیں۔ نئے لفظ ڈھونڈتے وقت اپنے اس خزانے کو بھولنا نہ چاہیئے۔ اس خزانے میں بھی نیا لفظ نہ ملے تو نئی چیز

www.taemeernews.com

کے لیے نئے نام کو جوں کا توں لیا جا سکتا ہے اپنی اصل شکل میں اس کا بولنا اچھا نہ لگتا ہو تو اسے تھوڑا بہت بدل بھی دینا چاہیے۔ RAIL کو ریل کہیئے اور LANTERN کو لالٹین کہنے سے نہ گھبرایئے۔ جب یہ پردیسی لفظ لے لیجئے تو اُسے اپنوں کا اپنا جامہ جو ہمارے اپنے لفظوں پر لگتے ہوں وہی اس پہ لگایئے کہ پھر کون پہچان نہ سکے کہ یہ پہلے سے ان کا ہے یا بعد کو آ ملا ہے۔ سائنس کی کتابوں کے لیے یورپی زبانوں سے بہت سے لفظ لینے چاہئیں۔ ہندی اردو والے مل کر ایک ہی لفظ چنیں تو اچھا ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ نئی کتابیں بھی ایک دوسرے کے لئے بے کار ہوں گی، عربی اور سنسکرت سے بھی ابھی بہت سے لفظ اور لینے ہوں گے مگر دونوں سے وہی لیا جائے جو ہماری زبان سے میل کھائے اور ہمارا کام نکالے۔ نہ سنسکرت سے اس لئے کچھ لیا جائے کہ اس سے ہماری زبان شدھ ہو گی، نہ عربی سے اس لئے کہ وہ زبان کو مقدس بنا دے گی۔ یہی پہلے دن سے ہماری زبان کا دستور رہا ہے۔ اسی پہ چلنا چاہیے۔ ہندستانی کا راستہ یہی ہے۔

اگر نئے لفظوں کے لینے میں اردو ہندی والے مل کر کام کریں، مدرسوں میں پڑھائی کی کتابیں ایک زبان میں لکھی جائیں اخبار بول چال کی زبان سے دور نہ بھاگیں، شمالی ہند کے ریڈیو اسٹیشنوں سے وہی زبان بولی جائے جو اس سارے علاقے کے لوگ بولتے سمجھتے ہوں تھیئٹر اور سینما میں بھی اسی زبان کا چلن ہو جس میں نہ موٹے موٹے عربی لفظ بھرے ہوں نہ بے ڈھنگے سنسکرت بول۔ تو ہندستانی کو دو الگ الگ ادبی زبانوں میں بانٹ دینے کی رو رک جائے۔ بول چال، کاروبار اور کم سے کم مدرسوں میں پڑھائی کی زبان تو ایک رہے۔ آگے چل کر بہت مشکل علمی باتیں کہنے کے لئے چاہے دو الگ طرز ہوں اور شاعری میں بھی لوگ الگ لے الاپیں مگر میں تو سمجھتا ہوں کہ زمانے کی رو اس اونچے علمی اور ادبی کام اور شاعری کو بھی اس ملی جلی ہندستانی کی طرف لائے گی۔ زبان کا ادب اب بہت دن ایک چھوٹی سی ٹولی کا دھندا نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کہ زبان کچھ ہو، ایک سماجی چیز ہے۔ یہ آدمی سے آدمی کا رشتہ جوڑتی ہے۔ ایک دل کی بات دوسرے تک پہنچاتی ہے۔ اکیلے کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ جوں جوں لکھنے والوں کو اپنی بات سمجھانے کی ضرورت زیادہ پڑے گی جیسے جیسے زیادہ لوگ ان باتوں کو سمجھنا چاہیں گے۔ زبان کا ادب سہل اور صاف ہوتا جائے گا۔ یہ کتابیں لکھنے والے بھی جو کبھی کبھی زندگی سے الگ رہ کر نہ جانے کس سے اپنی پہیلیاں بجھوانا چاہتے ہیں۔ آخر آدمی ہیں کنویں کے مینڈک تو نہیں ہیں کہ اپنی ٹرآپ سن لیں اور سو رہیں۔ یہ آدمیوں ہی سے کچھ کہنا چاہتے ہیں اور ان کا دل بھی اس کے لئے بے چین ہوتا ہے۔ کہ آدمی انھیں سمجھیں۔ یہ مجبور ہوں گے کہ زبان کو صاف کریں۔ کچھ کہیں کہ ایسے کہیں کہ کوئی سمجھے بھی۔ زبانوں کی تاریخ جاننے والے جانتے ہیں کہ زبان جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے بولنے اور لکھنے والے کے مقابلہ میں سننے اور پڑھنے والے کا اثر اس پہ بڑھتا جاتا ہے اور کیوں نہ ہو۔ زبان سماج کی لونڈی ہے۔ سننے والوں سے کیسے منہ موڑ سکتی ہے یہ بولنے والے کے دل کا حال تو کہتی ہے۔ پر سننے والے کی سمجھ کا پاس بھی اسے کرنا ہوتا ہے۔ ہاں! شاعری میں کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں۔ جن میں کہنے والا بس اپنا جی ہلکا کرنا چاہتا ہے کبھی ایک آہ سے کبھی ایک واہ سے۔ پر میں تو سمجھتا ہوں کہ اس دل کو ہلکا کرنے کے لئے بھی شاعر کو سمجھنے والوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی سنسان میدان میں ایک سوکھے ٹھنٹھ پر کبھی کبھی کوئی چڑیا گا لیتی ہے۔ پر زیادہ بلبل باغ ہی میں چہچہاتے ہیں۔ اس لئے میرا تو خیال ہے کہ شاعر اور ادیب بھی جلد ہی ہندوستانی میں لکھا کریں گے۔ یعنی اس بول چال کی صاف زبان میں جس سے کوئی لفظ اس لیے

www.taemeernews.com

سمو دی جائے کہ وہ کہیں اور سے آیا ہے۔ اور جس میں برابر نئے لفظ بھی باہر سے لئے جائیں گے۔ مگر بے میل موٹے موٹے لفظ عربی کے ہوں کہ سنسکرت کے۔ اس میں یوں ہی نہ ٹھونسے جائیں گے۔ یہ ہندستانی قوم کے آپس کے میل جول کی نشانی ہوگی۔ ہمارے پچھلے کاموں کی یادگار، ہمارے آگے حوصلوں کا آئینہ!

اس سلسلے کی پانچویں تقریر پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کی ہے جو آل انڈیا ریڈیو سے ۲۴ فروری ۱۹۳۹ء کو سنائی گئی جس کا اقتباس حاضر ہے:۔

۵۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی

"ہندستانی کیا ہے؟ اس کا مطلب یہی ہے کہ ایسی بولی جسے ہندستان کے سارے آدمی سمجھ سکیں اور بول بھی سکیں۔ گھڑی بھر کے لیے یہ مان لیجئے کہ ایسی بولی اس وقت دیس میں کوئی نہیں ہے۔ تو یہ پوچھا جائے گا کہ کیا ایسی بولی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کا جواب ہے ہاں ہو سکتی ہے۔ یہ یوں کہ پہاڑی بستیوں کو چھوڑ کر جہاں کی بولیوں کا کھنڈ ا کچھ نرالا ہی ہے باقی ملک میں جو بولیں سرنام ہیں۔ ان کو دو ٹولیوں میں بانٹ سکتے ہیں ایک آرین دوسری دراوڑی۔ اردو ہندی مرہٹی بولیاں آرین ہیں اور تامل تیلگو اور دوسری دیسی زبانیں دراوڑی ہیں۔ آج کل ہر چیز گڈمڈ ہو رہی ہے۔ زبانوں کا بھی یہی حال ہے۔ کتابوں کی بات تو رہی الگ۔ یہاں بس یہ کہنا ہے اور یہی پوچھا گیا ہے کہ ایسی بولی کون سی ہے، جسے سب سمجھ لیں اور بول بھی سکیں۔ اس کو مان کر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ بولی ہندستانی ہی ہے۔ ہندستانی کیا چیز ہے؟ اس کا جواب بہت دن ہوئے پٹنہ میں دیا گیا۔ بہار سرکار کو یہ بتانے کے لئے کہ بچوں کی کتابیں کیسی زبان میں ہوں۔ بہت سے لوگ جگہ جگہ سے آکر پٹنہ میں اکٹھے ہوئے میں بھی ان میں تھا۔ سب کی صلاح سے بتایا گیا کہ کتابیں ایسی ہونی چاہئیں۔ جن کو ہندی میں لکھا جائے۔ تو ہندی والے بچے اچھی طرح سمجھ لیں اور اردو میں لکھا جائے تو اردو پڑھنے والے بچے اچھی طرح سے سمجھ سکیں۔ اس کے سوا یہ ہوا کہ لمبی چوڑی بات چیت ہو کر اردو اور ہندی والوں نے یہ ٹھہرایا کہ ہندستانی کیا ہے؟ ہر زبان کے اخباروں میں اس کی بابت چھپ چکا ہے۔ اس لئے یہاں اس کو میں نہیں دہراؤں گا۔ اسے سمجھو تہ کہو یا آپس کا فیصلہ۔ اس پر ہندی والوں کی طرف سے بابو راجندر پرشاد صاحب نے اور اردو والوں کی طرف سے مولوی عبدالحق صاحب نے دستخط کیے۔ یہ پایا جاتا ہے۔ کہ کم سے کم بہار کی سرکار نے تو اسے مان لیا۔ مان ہی نہیں لیا بلکہ فیصلے پر وہاں کام بھی ہونے لگا۔ اس نے ہندستانی کمیٹی صوبۂ بہار کے نام سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک کمیٹی بھی بنائی جو بابو راجندر پرشاد صاحب کے نیچے کام کر رہی ہے۔ پر سب کو سمجھانے کے لئے کچھ اور کہنا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ ایسی بولی جسے سب سمجھ سکیں اور جسے سب سمجھ سکتے ہوں۔ آسے وہ کسی نہ کسی ڈھنگ سے بول بھی سکتے ہیں سنیے:۔

اچھا کا ناس کر ہم یہ کہتے ہیں۔ بہت خوب! بنگالی صاحب کہتے ہیں بیش بھالو' دونوں تعریفیں ایک جیسی ہیں۔ بیش کے معنی بہت اور خوب کے ہیں۔ اچھے یا بھلے کو اپنا اپنا بولنے کا رسنہ ہے۔ بھلے کا بھالو بن گیا۔ بات ایک ہی رہی۔ اب ملک کے اوپر اور نیچے کے حصوں کو لیجئے۔ پنجاب میں کسی کو پکار کر بلائیں تو اسے ہانک مارنا کہتے ہیں۔ بالکل یوں ہی اور یہی مرہٹی میں بولتے ہیں۔ دونوں میں بال برابر بل نہیں۔ یہ اور ایسی باتیں اور لمبی کر کے پھیلائی جا سکتی ہیں۔ جیسے یہ کہ نظم یعنی کتابی بحث سے چند لفظ ہندی اور تامل جیسی زبانوں کی سادھارن کبتا اور ناٹکوں میں آگئے ہیں۔ اور اس طرح ہندی کے اور بنگالی کے اردو میں آگئے ہیں۔ زبانوں اور بولیوں میں ایک

www.taemeernews.com

گڑبڑ مچی ہوئی ہے۔ اب انگریزی بھی اردو، ہندی، بنگالی اور ہماری دوسری زبانوں میں اپنا گھر کر رہی ہے اور کیوں نہ کرے۔ وہ بھی تو آرین زبان ہی ہے۔ ہندستانی کی جڑ تو اسی دن جم گئی۔ جس دن کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کا چھاپہ خانہ کھولا گیا۔ کتابوں کے سوا جو ہندستانیوں سے لکھوائی گئیں۔ جان گل کرسٹ، شیکسپیئر اور فاربس جیسے ہندستانی جاننے والے انگریزوں نے ہندستانی کی ڈکشنریاں اور گریمریں آپ لکھیں۔ اس کے پیچھے لوگوں کی مت ایسی بدلی اور کچھ ایسی رُو چلی کہ زبان چھیچا لیدر ہو گئی اس کا نمونہ دو ترجمے ہیں جن پر میں ابھی کچھ کہوں گا۔

"فیڈرل لیجس لیچر کے لیے فہرست رائے دہندگان تیار کرنے کے سلسلے میں جو ابتدائی
کارروائی کی جائے گی۔ اس کے بدلے میں سر این این سرکار لا ممبر نے آج اسمبلی میں
روشنی ڈالی۔"

دوسرا لیکھ جس کو پوچھا گیا ہے۔ کس زبان میں ٹھہرتا ہے۔ یہ ہے۔

"سینکٹ پرانتیہ ویوستھا پکا پریشد میں ایک پرشن کا اُتر دیتے ہوئے نیائے منتری ڈاکٹر کاٹجو نے
ان اُدیوگ دھندوں کی سوچی دی۔ جن کی انتی کے لئے سرکار نے سہایتا دینا سویکار کیا ہے۔"

اس میں یہ بتانا ہے کہ فیڈرل لیجس لیچر FEDERAL LEGISLATURE تو جوں کا توں رہے گا کیوں کہ یہ ایک نام ہے۔ ہم سیوک رام کو عبداللہ نہیں بنا سکتے۔ نہ خدا بخش کو رام دتا کر سکتے ہیں۔ فہرست بھی ٹھیک ہے۔ اسے گنوار تک سمجھتے ہیں۔ چاہے بولتے وہ فہرست ہوں۔ مگر فہرست کے نیچے جو فارسی کی اضافت لگائی گئی ہے یہ ہندستانی میں نہیں کھپ سکتی۔ یہ نہیں چاہیے تھا۔ پھر آتا ہے رائے دہندگان اسے ان پڑھ گاؤں والے چاہے کچھ نہ کچھ سمجھ بھی لیں۔ تو بھی یہ فارسی کا بھاری بھر کم ملاؤ ہندستانی میں جگہ نہیں رکھتا۔ "ابتدائی کارروائی" یہ ٹکڑا ابھی بدلا جا سکتا ہے۔ "اس کے بارے میں" کی جگہ "اس کی بابت" ہونا چاہیے۔ جسے سب سمجھتے اور بہت سے لوگ بولتے ہیں۔ "روشنی ڈالنا" بھی کھٹکتا ہے۔ نہ یہ ٹھیک ترجمہ ہے مطلب یہ کہ ترجمہ اردو ہے۔ ہندستانی نہیں۔ اس کی ہندستانی میری سمجھ میں یہ ہوتی ہے:۔

"فیڈرل لیجس لیچر کے لیے رائے دینے والوں کی فہرستیں بنانے میں پہلے جو کام کیا جائے گا۔
اس کی بابت سر این این سرکار قانونی ممبر نے آج اسمبلی میں سب کچھ کھول کر بتایا۔"

یہ دوسرا ترجمہ میں نہیں کہہ سکتا کس زبان میں ہے۔ سادھارن آدمی اس سے کچھ نہ سمجھے گا پہلے ہی "سنیکت" رکھا ہوا ہے۔ جو بہت موٹا لفظ ہے جس کو سنسکرت پڑھا ہوا ہی سمجھ سکتا ہے یہ ترجمہ ہے "یونائیٹڈ" کا۔ ابھی کہہ چکا ہوں کہ ناموں کا ترجمہ نہیں کیا کرتے۔ "سنیکت پرانتیہ ویوستھا پکا پریشد" کسی کھینچ تان سے بھی نہ تو ہندی کہا جا سکتا ہے اور نہ ہندستانی یہی حال "ادیوگ دھندوں" کا ہے اصل میں مینوفیکچر MANUFACTURE تھا جس کا ترجمہ دھندا کر لیا گیا۔ دھندے میں دوکانداری اور روپے کا لین دین بھی آتا ہے۔ جو بینک کرتے ہیں۔ یہاں یہ مطلب نہیں۔ میں اس کو ہندی کبھی نہیں کہہ سکتا یہ کوئی انوکھی اور نرالی بولی ہے۔ اگر اسے یوں کہا جائے تو اس کی ہندی میں یوں بناتا۔

www.taemeernews.com

"یو۔ پی کی اسمبلی میں نیا سے منتری ڈاکٹر کاٹجو نے ایک پرش کا اتر دیتے ہوئے ان نئے کارخانوں کی سوچی دی جنکی انتی جانچ ابھی ہوئی ہے اور جن کے لئے سرکار نے مدد دینا منظور کیا۔"

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ غریب نواز جیسے فارسی ٹکڑوں کی طرح 'مدد' اور 'منظور' ہندی میں آ چکے ہیں اور آتے جاتے ہیں جاننا چاہیے کہ 'رومال' کو 'مکھ مارجن بستر کھنڈ' کہنا ایسا لگتا ہے جیسے 'بھوک ہڑتال' کو 'مفاطعہ جوع' اس لئے اس ترجمگی زبان کا کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ بات کو تھوڑا کر کے یہ کہنا کہ اسی کا کچھ نام ہی رکھنا ہے تو اسے سنسکرتی ہندی کہہ سکتے ہیں۔

کبیر جی اور شاہ نظیر جس بولی میں اپنا راگ گا گئے۔ وہ ہندستانی کی داغ بیل تھی۔ اس کے پیچھے سرکار نے جو کچھ کیا وہ ابھی بتایا گیا ہے۔ اب جو کچھ کرنا ہے۔ وہ سب کے سامنے ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک ایسی بولی کو سارے ملک میں پھیلایا جائے جس کو سب سمجھ سکیں۔ چھاؤنی میں لال کرتی بازار کے کباڑی کا یہ کہنا صاحب ٹوروپی TWO RUPEE خوشی ٹھیک TAKE خوشی نہ ٹھیک۔ کہنے والے کے دل کی بات زیادہ کھول کر دکھاتا ہے اور سننے والا بھی سمجھ جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ یہ کہے "میں ردّ قول کو ردّ عمل سے کم قابل تعزیر نہیں قرار دیتا۔ دو روپے سے کم لینا میرے نزدیک بمنزلہ گناہ کے ہے۔" تو کہئیے اسے کون سمجھے گا؟ یہیں لنگوا فرینکا یا سادھارن بولی کی رام کہانی چھڑتی ہے۔

زبان کی جانچ پڑتال کے پھیر میں مجھے یہ پتہ چلا ہے کہ جب سے دیسی زبان والے فارسی اور عربی اور سنسکرت کے سامنے اندھا دھند ہاتھ پھیلانے لگے تب سے نئے لفظ اور نئے جوڑ میل گھڑنے سے رہ گئے اور وہ ایک دیندار کے کنوڑے بن گئے۔ میں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ زبانیں اب ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کوئی نئی گھڑنت ایسی نہیں دکھا سکیں جو بولتی مورت سمجھی جا سکیں۔

علم کی کتابوں کا ذکر نہیں۔ جن میں بہت سے لگے بندھے لفظ ایسے ہوا ہی کرتے ہیں۔ جن کا سمجھنا بہت کٹھن ہے۔ اعلیٰ سے ہیں کام نہیں اور میں تو یہ کہوں گا کہ اگر دل پہ ہاتھ رکھ کر اور آنکھیں کھول کر دیکھیں اور من میں بس یہی چاہت ہے کہ دوسرے کو گر سمجھا دینا ہے۔ تو اس کا رستہ بھی نکل سکتا ہے۔ دیکھئے ہائیڈرو الیکٹرک HYDRO ELECTRIC کے لئے کیوں ہم عربی یا سنسکرت کے پلیے اور نو کھے ان گھڑ لفظ لیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ ہم ہائیڈرو الیکٹرک 'کو' بن بجلی' کیوں نہ کہیں اور لکھیں۔ ہر ایک سنتے ہی سمجھ جائے گا۔ کہ وہ بجلی جو پانی کی طاقت سے پیدا کی جائے۔ 'یہ ہے ہندستانی'۔ یوں سوچ بچار اور کھلے دل سے کام لیں تو جو باتیں ہم کو پہاڑ دکھائی دیتی ہیں وہ رائی بن جائیں جب ایک زبان بن جاتی ہے وہ چاہے کتنی ان گھڑ اور بے تکی ہو تھوڑے دنوں میں نکھر سنور کر اپنے آپ سہانی ہو جاتی ہے۔ ہندستانی کو یہی کرنا ہے کیونکہ وہ پہلے ہی نکھی ہوئی اور ستھری ہے۔ کرنا بس یہ ہے کہ ہم اسے اس کی جگہ پر بٹھا دیں۔

اس سلسلے کی چھٹی اور آخری تقریر بیرسٹر آصف علی کی ہے۔ جو آل انڈیا ریڈیو سے ۲۵ فروری ۱۹۳۹ء کو نشر ہوئی۔ اس کا ضروری اقتباس ذیل میں درج ہے:۔

۶۔ آصف علی بیرسٹر ایٹ لا

آج پانچ دن سے اردو ہندی کی گتھیوں کو سلجھایا جا رہا ہے۔ کھرے کھوٹے کی پرکھ کے گر بتائے جا رہے ہیں اور بول چال کے سانچے الٹ پلٹ کر دکھائے گئے ہیں۔ پرکھ کا سوال آتا ہے کہ اس زبان کو جانچنا ہے جو بولی جاتی ہے یا نئی بولی بنانی ہے۔

www.taemeernews.com

جو اردو اور ہندی آج لکھی جاتی ہے وہ کھری بھاشا نہیں جس سے اردو بنی اور جس نے خسرو کا دل موہ لیا تھا۔ ہندستانی تاریخ میں وہ دن نہیں تھا جب برج بھاشا اور فارسی نے گلے مل کر اردو کا چولا بدلا تھا اور دو تہذیبوں یا سبھتاؤں کا میل اور سنجوگ ہوا تھا۔ یوں تو مسلمانوں کے ہندوستان میں رہے بسے پچھلے چھ سو سال تک راج اور دفتر کی زبان فارسی رہی پر عام لوگوں نے بول چال کی زبان اردو ٹھہرائی تھی۔ جو آگے چل کر اردو بن گئی۔ جس طرح آج انگریزی زبان سے ہندوستانی زبانوں کا لین دین چل رہا ہے۔ وہی پچھلے سات سو برس میں فارسی عربی سے رہا اس سے زبان میں بڑھوتری ہی ہوتی ہے۔ کچھ گھٹتا نہیں۔ ہاں ہر زبان کا ایک ڈھانچا ہوتا ہے جس میں دوسری زبانوں کے بعضے لفظ کی بیٹھک اور کھپت ہو سکتی ہے اور بعضوں کی نہیں۔ بولنے والے آپ کانٹ چھانٹ اور چھیل چھال کے اوپری لفظوں کو سانچے میں بٹھا لیتے ہیں۔ ٹمن۔ بوتل۔ ریل۔ ریڈیو۔ اسکول اسٹیشن سب جیسے اردو میں آ گئے اسی طرح سنسکرت عربی فارسی اور ترکی کے لفظوں کا حال ہوا۔ اردو یا ہندی میں ان زبانوں کے لفظوں کا رنگ روپ چھوڑ معنی تک بدل گئے ہیں۔ آج لوگ خواہ مخواہ اصل لفظ اور معنی یا ارتھ اور اچارن پر زور دیتے ہیں۔ اردو میں تو ان گنت لفظ برج بھاشا کے دبے ہیں۔ جو سات سو برس پہلے تھے۔ عربی اور فارسی کے جو لفظ بھی آ گئے ہیں وہ پچھر رسائی میں آ چکے ہیں جو نئی ناپ تول اور کھینچا تانی آج چل رہی ہے اس سے نہ اردو عربی فارسی اور نہ ہندی سنسکرت بن سکتی ہے۔ اگر فارسی یا سنسکرت عام زبان ہو سکتیں تو اردو اور بیچاسوں پراکرتیں کیوں جنم لیتیں۔ مسلمانوں کے آنے سے پہلے تو سنسکرت کا رستہ کھلا تھا۔ بات اتنی تھی کہ جب تک ہندستان میں ان پڑھوں کی گنتی رہے گی جو آج ہے۔ بول چال اور لکھے پڑھوں کی زبانوں میں فرق رہے گا عام مسلمانوں نے جو باہر سے نہیں آئے تھے۔ بولتے رہے آج بھی کروڑوں ہندو مسلمان پشتو۔ پنجابی۔ گجراتی۔ سندھی۔ بنگالی۔ اڑیہ۔ کوکنی۔ مرہٹی۔ تامل۔ تلوگو۔ ملایالم۔ کانڑی۔ مارواڑی اور اور زبانیں بولتے ہیں۔ اسی طرح ہندستان کا ایک بہت بڑا ٹکڑا اردو بولنے لگا۔ ہاں جہاں علم و فن کا سوال ہے۔ اردو اور ہندی دونوں کا ڈیل ڈول الگ ہے۔ ہزار ڈھانچا، گریمر، قواعد دبا کر ایک ہوں پر علم و فن فلسفہ، دین دھرم اور سوچ بچار کے پیچیدہ مضمونوں میں پورا اڈا لینے کے لئے اردو عربی فارسی اور ہندی سنسکرت سے لفظ لئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ رہی دلی کی اردو تو یہ وہی زبان ہے جو سات سو برس سے چلی آئی ہے اور اب پل بڑھ کر اتنا روپ نکال چکی ہے اور پرانی برج کی کہاوتیں، دوہے، بھجن، گیت، مکرنیاں، پہیلیاں اور محاورے اس زبان کا آج بھی سنگار ہیں اگر اسے ٹکسالی زبان مان لیجیے تو اس کسوٹی پہ کھرا کھوٹا پرکھنا کیا مشکل ہے۔ آج کل جو اردو یا ہندی پالی پوسی جا رہی ہے اس کا تو نری ہٹ سے نکاس ہوا ہے۔ ایک طرف عربی فارسی کے بوجھل لفظ سے لئے جاتے ہیں۔ تو دوسری طرف جان جان کر سنسکرت کے شبد ٹھونسے جاتے ہیں۔ ٹکسالی اردو کی پہچان کا سیدھا گر ہے کہ عربی اور سنسکرت ڈکشنریاں دیکھے بن کام چل سکے۔ اگر پرانا ہندستان یعنی دلی، آگرہ، اودھ، پنجاب اور بہار، راجپوتانہ۔ مگدھ دیش اور دکن اور دلی کو کسوٹی بنا لیتے آج گورکھ دھندے کے بول اور پھیروں میں نہ الجھتے۔ گھر لو بیجوں سے کھیتی ہو گی تو جیسا بوگے ویسے کاٹو گا۔ جو کے کھیت میں گیہوں اور بیر کے باغ میں انار تو ہونے سے رہے۔

زبانیں تین طرح بنتی اور پھیلتی ہیں۔ سب سے پہلے تو آدمی کی ضرورتوں سے۔ جب آدمی کچھ کہنا چاہتا ہے تو اس کے لفظ بھی ٹٹول لیتا ہے۔ یہ ترکیب لاکھوں برس سے جاری ہے۔ جس نے دیس دیس کی زبان الگ بنا دی اور دیس تو دیس شہر شہر محلے ٹولے کے لب و لہجہ میں پھیر ہو جاتا ہے۔ جسے جاننے والا سنتے ہی تاڑ لیتا ہے۔ دوسرے دین دھرم اور راج پاٹ کی چھاؤں میں۔ بدھ دھرم سنسکرت اور پالی

www.taemeernews.com

کے لفظوں کو چین جاپان لے گیا۔ عیسائی مذہب نے عبرانی کے بعض لفظوں کو دنیا بھر میں پھیلا دیا۔ اسلام نے عربی کے لفظوں کو دیس بدیس میں پہنچا دیا۔ تیسرے راج جھنڈے تلے۔ اس کی مثالیں بہتیری ہیں۔ آج ہم آپ بھی انگریزی بولنے اور لکھنے پر مجبور ہیں جس کا راج اس کی زبان۔ مگر یہ بات ٹھیک نہیں کہ زبان ایک ہونے سے جھگڑے ٹنٹے مٹ جاتے ہیں۔ کیا مہابھارت نہیں ہوئی۔ فارسی عربی بولنے والے آپس میں نہیں لڑے۔ انگریزی بولنے والوں میں لڑائیاں نہیں ہوئیں اگر زبان ایک ہونے سے جھگڑے چک سکیں تو ساری دنیا کی زبان ایک بنانی چاہیے۔ ایک دفعہ یورپ میں اس خیال سے اسپرانٹو زبان چلانے کا زور بندھا تھا۔ مگر پار نہ بسائی۔ لڑائی جھگڑوں میں تو نہ جانے خود غرضی کے تانے بانے پورے جاتے ہیں۔ مگر یہ سچ ہے کہ اپنی کہہ اور دوسرے کی سن سکے تو ایک رکاوٹ گھٹ جاتی ہے۔ اس لئے اگر سارا ہندستان انگریزی کی جگہ اور زبان بولنے لگے تو اچھا ہوگا۔ اس خیال سے ایک نئی زبان جسے ہندستانی کہیں بنا لیجئے اور اس میں سب ہندستانی دیسوں کی زبانوں کی ایک ایسی کھچڑی ہونی چاہیے۔ جو رچ پچ جائے۔ جس طرح انگریزوں نے آٹھ نو سو لفظ ایسے چن لئے ہیں۔ جو بول چال اور معمولی کارروائی کے لیے کافی ہیں اور وہ بنیادی انگریزی بن گئی۔ ہم بھی ہندستان بھر کے لئے ہندی اُردو کے وہ لفظ چھانٹ لیں جو دوسرے دیسوں کی زبانوں میں کسی نہ کسی روپ میں ملتے ہوں اور اُسے 'ہندستانی بولی' ٹھہرا لیں۔ ہندستان ایک دیس تو نہیں یہ تو کئی دیسوں کا مہادیس ہے۔ ہندستانی، پنجابی، پٹھان، بہاری، بنگالی، مدراسی، دکنی، مرہٹے، گجراتی، سندھی، راجپوت، مارواڑی، میواڑی، اڑیہ سب کے رسم و رواج پہننا اوڑھنا، کھانا، پینا، رہن سہن، ملے جلے ہونے پر بولیاں الگ ہیں۔ اس لئے انگریزی کی جگہ ہندستانی ہو جائے گی مگر یہ ہندستانی تو بنانی پڑے گی۔ جو نہ آج کی اردو ہو سکتی ہے اور نہ ہندی اس لئے کہ یہ دونوں نئے رستوں پر گئی ہیں۔ دلّی اجڑی، لکھنؤ کا چراغ بھی بجھ گیا۔ پھر لاہور اور حیدرآباد نے اس کو سینچنا شروع کیا۔ جوں جوں دلّی کی اردو میں باہر جا کر عربی فارسی کے گل بوٹے کھلے اور

دوسری طرف راج نیتک بھاؤ بڑھا اور لفظ بھی جو اردو کی جان تھے ہندی میں پراچین سنسکرت کا چولا پہن پہن کر سامنے آ کھڑے ہوتے۔ پرانی اردو اور ہندی میں ان گنت لفظ ایک تھے اور بیسیوں پیڑھیوں سے لوگ وہ بولتے آئے تھے۔ مگر آج سب کی شکلیں بدل رہی ہیں۔ ادھر عربی فارسی کا بھاؤ ہے۔ ادھر سنسکرت کا چڑھاؤ۔ اُدھر نیند خواب تو ادھر شانتی ادھر بیکل اضطراب تو اُدھر ویاکل ہونا ادھر بیٹھک نشست تو ادھر ادھیشن ادھر بیتا ساختہ تو اُدھر دیپتی اور تو اور سورج سویرہ۔ رات راتری۔ جاگ جاگرتی۔ سبھا اور سدھ بھی شبھا اور شدھ ہو گئے۔ آج ہندی والے عربی فارسی کے اُن لفظوں کو جو ڈھل ڈھلا کر اردو ہو گئے تھے چن چن کر نکالتے ہیں اور پرانی پراکرت کے ڈھلے ڈھلائے بولوں کو بھی سنسکرت میں رنگتے ہیں اور اُردو والے ہوتے ہواتے اردو کے لفظ چھوڑ کر عربی فارسی پر گرتے اور ٹوٹتے ہیں۔ وہ سیدھی سادی اُردو جو دلّی میں سیکڑوں برس سے بولتے چلے آئے ہیں آج بھی نوے گھر وہی ہے جو برج والوں سے سیکھی تھی۔ آخر آج اس میں کیا بس گھل گیا ہے کہ برس کا ورش، بس کا وش، جتن کا یتن۔ کارن کا کارنڑ۔ اچرج کا آشچریہ بنایا جاتا ہے۔ یہی حال رہا تو اگر چار پانچ برس میں اُردو اور ہندی الگ منہ موڑ کے بیٹھ جائیں تو مجھے اچنبھا نہ ہوگا۔ بول چال اور علم و فن کی زبان میں ضرور پھیر پڑ جاتا ہے۔ بول چال میں زبان ہلکی پھلکی رہ سکتی ہے۔ مگر علم و فن میں کورے کہاوتوں اور نرے محاوروں سے بات نہیں بنتی۔ بیچارے انشاء اللہ خان نے لکھنؤ میں یہ بھی کر کے دیکھ لیا اور ان کی کوشش کا نمونہ دریائے لطافت میں ملتا ہے۔ اس وقت ہندی اور اردو جس چال سے بڑھ رہی ہیں اور آگے بڑھتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس کا نتیجہ صاف ہے اور وہ یہ کہ

www.taemeernews.com

دو زبانیں الگ الگ ہوگئی ہیں اور ہو جائیں گی۔ اس لئے روٹھنے اور ہٹ کرنے کا کام نہیں۔ دونوں کو الگ چلنے دیا جائے اور ہندستانی ایک تیسری زبان سوچ بچار کر کے بنائی جائے۔ نچلی جماعتوں میں ہندستانی پڑھائی جائے اور اونچی جماعتوں میں جو جس کی زبان ہو پڑھائی جائے۔ کسی کو کسی سے شکایت نہیں۔ ہندی کو ہندستانی یا اُردو کو ہندستانی کہنے کی ضرورت نہیں۔ جس کی جہاں مانگ ہوگی وہی بولی چلے گی۔ گرما گرمی گھٹے گی اور سبھا بھی کا بخار ہلکا پڑے گا۔ تو ہو سکتا ہے کہ اردو ہندی کے میل کا نیا رستہ نکل آئے۔

میری ساری رام کہانی کا نچوڑ یہ ہے کہ اُردو ہندی، ہندستانی تین الگ زبانیں ہیں اُردو تو بنی بنائی ہے اور ہندی بھی اب بن چکی ہے۔ ان دونوں کے سنجوگ سے جو گنگا جمنی زبان بننے والی ہے وہ ہندستانی ہے۔ یہ کام نئی "ناٹک" کا ہے کہ وہ اس نئی بھاشا کی جوتیں اس طرح بٹھائیں کہ اس میں کان نہ ہے۔

تقریباً اڑتالیس سال قبل کی مذکورہ تقاریر سے اُردو۔ ہندی اور ہندوستانی کے درمیان جو نزاع اُٹھ کھڑا ہوا تھا اس کے وجوہ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ انڈین نیشنل کانگریس اور نیشنل مسلمان کے خیالات سے بھی چند نکات مرتب ہوتے ہیں ہندستانی کیسی ہونا چاہیے؟ ان تقاریر میں سے ہم چند الفاظ منتخب کرتے ہیں جو ڈاکٹر تارا چند، بابو راجندر پرشاد، ڈاکٹر ذاکر حسین کیفی دتاتریہ اور بیرسٹر آصف علی نے استعمال کئے ہیں وہ یہ ہیں۔ کویوں۔ کوتابیں۔ انت سنگاستن۔ پودھ کھشائی۔ گدھ۔ ساہتیہ۔ وبرھا۔ جیون، آکاش ان ساپن جیبی۔ ورودھی۔ دکھ دائی۔ پری بھاشک شبد۔ بسیں۔ اچھروں۔ راشٹر بھاشا، ویاکرن۔ دیو بار لیکھوں۔ دھشکار شبد۔ بہو وچن۔ سوابھاوک۔ کیول۔ کوش انتی۔ بہتیرے جنم پتر سے۔ سودیشی۔ گھنیا۔ بھدہ سرنام۔ بل ساو دھارن۔ چھپا لیدر لیکھ ولاؤ۔ گھرنت ارتھ ما چارن۔ چو رسائی۔ راج نیک بھاؤ وغیرہ۔ ان الفاظ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہندستانی کیا ہے؟ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی تقریر کو اردو کی تقریر کہا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر اور بیرسٹر آصف کی تقاریر بھی سمجھ میں آتی ہیں۔ لیکن ڈاکٹر تارا چند اور بابو راجندر پرشاد کی تقاریر میں ایسے الفاظ کثرت سے آگئے ہیں۔ جن کو اردو نہیں کہا جا سکتا۔ یہ کوئی نئی زبان ہو سکتی ہے۔

---

www.taemeernews.com

اُردُو، ہندی، ہندستانی اور مسٹر گاندھی

معرکہ آرا : ڈاکٹر عبدالحق - سر سید احمد خاں - مہاتما گاندھی

ابوالکلام آزاد - پنڈت مدن موہن مالویہ - سری نواس شاستری

اُردو، ہندی اور ہندوستانی کے متعلق مختلف حضرات کی چند تقاریر جو آل انڈیا ریڈیو سے ۱۹۳۹ء میں نشر ہوئی تھیں۔ ان کا مجملاً تعارف پیش کیا جا چکا ہے۔ یہ تقاریر کتابی شکل میں 'ہندوستانی' کے نام سے مکتبہ جامعہ دہلی اور ہفتہ وار "تیج ویکلی" دہلی میں بھی شائع ہو گئیں۔ جس سے اس زمانے کے دانشوروں کے خیالات معلوم ہو سکتے ہیں۔ مسٹر موہن داس کرم چند گاندھی آنجہانی ہندو قوم کے سب سے بڑے رہنما تھے۔ انہوں نے ۸ار دسمبر ۱۹۴۷ء کو اپنی قوم کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا: "میں ہمیشہ تو تمہارے پاس رہوں گا نہیں۔ مگر تم میرے رخصت ہو جانے کے بعد میرے الفاظ یاد کر دگے۔" مسٹر گاندھی کے فرمان آج بھی عزت اور وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ خطبات عبدالحق کے صفحہ ۴۶۱ پر جو عبارت ملتی ہے اس سے اس مسئلہ پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ یہ ایک تقریر ہے جو مولوی عبدالحق (بابائے اُردو) نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (دسمبر ۱۹۳۸ء) میں کی تھی۔ فرماتے ہیں۔

"میری زندگی کا صرف ایک ہی مقصد ہے یعنی زبانِ اردو کی اشاعت اور ترقی . . . . جب پنڈت مالویہ نے شدھی اور سنگھٹن کا قضیہ چھیڑا تو اس سلسلے میں ہندی زبان بھی آ گئی اور اس مذہبی جوش میں ہندی زبان کو خوب فروغ ہوا۔ اب یہ ادبی چیز نہ رہی بلکہ سیاسی اور مذہبی ہو گئی۔ پنڈت جی کی تحریک سے ہندی زبان کو بہت تقویت پہنچی اور خود انہوں نے اور ان کے ہم خیال اصحاب نے کوشش کر کے یہ نئی زبان بولنی اور لکھنی شروع کر دی۔ سب سے بڑی قوت اس وقت پہنچی جب گاندھی جی نے ساہتیہ سمیلن کی صدارت قبول کی اور ہندی کو ہندستان کی عام زبان بنانے کا بیڑا اٹھایا۔ اس سے سارے ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہندی کا غلغلہ مچ گیا اور صوبہ مدراس، پنجاب اور سرحد جیسے علاقوں میں جہاں کی زبانوں سے ہندی کا کوئی تعلق نہ تھا ہندی تیزی سے پھیلنی شروع ہو گئی اور وہاں کے ہندو اپنی اپنی حکومتوں سے ہندی کی تعلیم کا مطالبہ کرنے لگے جو نا واجب تھا کیونکہ ہندی نہ کبھی وہاں کی زبان تھی اور نہ اب ہے۔ یہاں تک کہ انڈین نیشنل کانگریس کا ریزولیوشن بھی پس پشت ڈال دیا گیا اور اس کی اشاعت میں لاکھوں روپے صرف کئے جا رہے ہیں۔ ایک طرف تو یہ دعویٰ ہے کہ ہم ہندوستان میں ایک قوم بنانا چاہتے ہیں اور اس قومیت کے دعوے کے ساتھ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ملک میں بول چال کی ایک زبان ہو اور وہ زبان ایسی ہو جو مشترک ہو۔ اور دوسری طرف جو زبان مشترک ہے اور دونوں قوموں کی یک جہتی اور اتحاد سے بنی ہے اسے خارج بھی کرنا چاہتے ہیں۔

ہندوستان میں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن وہ زبان جو بہت پہلے سے مشترک چلی آتی ہے یعنی اُردو زبان، اس کی حیثیت دوسری زبانوں سے بالکل جدا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ کسی خاص علاقے، قوم یا ذات میں محدود نہیں۔ ہندوستان کے ہر علاقے میں کچھ نہ کچھ اور بولی جاتی ہے اور اکثر علاقوں میں لکھی پڑھی جاتی ہے اور اسے دوسری زبانوں کے مقابلے میں ہر لحاظ سے مشترک ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ حیثیت دوسری زبانوں کو حاصل نہیں۔ یہ اُس تہذیب تمدن کی یادگار ہے جو ہندو مسلمانوں کے ربط ضبط سے پیدا ہوئی۔

www.taemeernews.com

جب انڈین نیشنل کانگریس نے یہ دیکھا کہ دونوں فریق مخالفت پر تُلے ہوئے ہیں۔ تو اس نے کچھ مصلحت اور کچھ رفع شر کے خیال سے یہ کہا کہ ہندی اور اُردو دونوں لفظ ترک کر دیئے اور ان کی جگہ 'ہندوستانی' کا 'ہندستانی' کا لفظ اختیار کیا اور اسی کو ملک کی زبان قرار دیا۔ مگر اس نے یہ نہیں بتایا کہ ہندستانی کسے کہتے ہیں۔ لیکن بڑا معرکہ بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے اجلاس میں ہوا۔ بحث یہ تھی کہ کاروباری زبان کیا ہو؟ گاندھی جی فرماتے تھے کہ ہندی اور میں (مولوی عبدالحق) کہتا تھا ہندوستانی۔ میری دلیل یہ تھی کہ جب انڈین نیشنل کانگریس نے ہندوستانی کے متعلق فیصلہ کر دیا ہے۔ تو اسے ماننے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ گاندھی جی نے فرمایا کہ وہ ریزولیوشن بھی میرا ہی بنایا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ اس وقت تو اس کا یہ مطلب نہ تھا۔ فرمایا کہ میں اب بتاتا ہوں۔ میں حیرت سے ان کا منہ تکنے لگا۔ اگر ہر دس بارہ برس بعد مفہوم بدلنے لگے تو پھر فیصلہ قابلِ اعتبار نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد انہوں نے "ہندی ہندستانی" کا نیا لفظ گھڑا۔ میں نے دریافت کیا کہ آپ کی ہندی سے کیا مراد ہے؟ کہنے لگے کہ وہ زبان جو کتابوں میں ہے۔ بول چال میں نہیں اور ہندستانی وہ زبان ہے جو بول چال میں ہے، کتابوں میں نہیں۔ اس پر میں نے پوچھا کہ پھر "ہندی ہندستانی" کیا ہوئی؟ فرمایا کہ وہ ہندی جو آگے چل کر ہندستانی ہو جائے۔ میں نے کہا کہ "جب ہندستانی پہلے سے موجود ہے۔ تو اس طولِ عمل کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سب بحث میں لکھ چکا ہوں اور آپ کو معلوم ہے اسے دہرانا نہیں چاہتا۔" آخر زچ ہو کر انہوں نے فرمایا کہ میں ہندی نہیں چھوڑ سکتا اور فیصلہ ووٹ سے کر دیا گیا۔ اب آپ ہی انصاف فرمایئے کہ جب گاندھی جی ہندی نہیں چھوڑ سکتے تو ہم اُردو کیسے چھوڑ دیں۔ اس کے بعد ہماری آنکھیں کھلیں۔ ہندی اردو کی بحث روز بروز نازک ہوتی جاتی ہے۔ جب ہماری طرف سے اعتراض ہوتا کہ ہندی یا ہندوستانی میں کثرت سے سنسکرت لفظ ملائے جا رہے ہیں تو اس کا جواب یہ دیا جاتا کہ اُردو میں بھی عربی کے الفاظ شامل کئے جا رہے ہیں لیکن اس میں اور اُس میں بڑا فرق ہے۔ ہم نے کبھی یہ نہیں کہا کہ اُردو میں عربی فارسی الفاظ لائے جائیں۔ برخلاف اس کے گاندھی جی، بابو راجندر پرشاد کاکا کالیلکر اور ان کے رفیقوں نے صاف طور پر اپنی اس پالیسی کا اعلان کیا ہے کہ سنسکرت لفظ زیادہ ملاتے جائیں اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ جنوبی ہند والے اس زبان کو سمجھ سکیں۔ کیونکہ ان کی زبان میں سنسکرت کے لفظ زیادہ ہیں۔ جنوبی ہند والے ان سے بدگمان اور ان کے مخالف ہیں کہ ان کو سنسکرت آمیز ہندی پڑھائی جاتی ہے اور ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ لوگ بڑے مکار ہیں۔ یہ ہندی کے نام سے ہمارے ملک میں سنسکرت پھیلانا چاہتے ہیں۔ اور ہماری زبان اور کلچر کو مٹانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جنوبی ہند والوں کی بدگمانی کچھ بے جا نہیں۔ جس دلیل سے وہ ہمیں پھسلانا چاہتے ہیں وہ ان کے مخالف پڑتی ہے۔ اعتراض صرف یہ نہیں کہ نئے نئے غیر مانوس اور ثقیل سنسکرت لفظ داخل کئے جا رہے ہیں بڑا غضب یہ ہے کہ جو لفظ سالہا سال بلکہ صدہا سال سے زبان میں رائج ہیں انہیں بھی خارج کیا جا رہا ہے اور اس سے بھی بڑا غضب یہ ہے کہ ٹھیٹ عام فہم ہندی لفظ بھی مردود قرار دیئے گئے اور ان کی جگہ یا تو اصل سنسکرت کا یا کوئی غیر مانوس لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ لفظ جب ایک بار زبان میں آ گیا۔ اور رائج ہو گیا تو وہ ہمارا ہو جاتا ہے۔ غیر مانوس نہیں رہتا۔ اسے غیر سمجھ کر نکالنا سخت بے دردی ہے[1]!

---

[1] اقتباس از خطبات عبدالحق صفحہ (۲۶۱ - ۲۶۶) طبع انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی

www.taemeernews.com

خطبات عبدالحق کے صفحہ ۳۰۷ سے ایک خطبہ کا آغاز ہوتا ہے یہ خطبہ بابائے اُردو نے ۳ اپریل ۱۹۴۸ء کو کل گجرات اردو کانفرنس احمد آباد میں دیا۔ اس خطبے میں اس موضوع پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ خطبہ طویل ہے۔ مگر ہم چند اقتباسات سے اردو کے ساتھ ناروا سلوک کا ذکر ذیل میں کرتے ہیں۔

" دوستو اور عزیزو! آپ نے ایسے وقت میں جبکہ ہندوستان میں اردو کے پھلنے اور مٹانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں کل گجرات اردو کانفرنس کا انعقاد اپنے تاریخی شہر احمد آباد میں کیا ہے ایسے وقت جبکہ حکومت کے ڈر سے اس کے خلاف اجتماعی طور پر آزادی سے اظہارِ رائے کرتے ہوئے لوگ ہچکتے اور گھبراتے ہیں۔ ہندوستان میں آزادی ملنے کے بعد یہ اردو کی پہلی کانفرنس ہے۔ جب پنڈت روی شنکر شکلا وزیراعظم سی۔ پی نے مسلمانوں کو مخاطب کرکے یہ کہا کہ ہم تمہاری وفاداری کے زبانی دعوؤں کو نہیں مانتے اپنی وفاداری کا عملی ثبوت دو۔ اور اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ اُردو زبان کو قطعاً ترک کردو، اشد اشد مخالف آپ کی قوت۔ آپ کے اتحاد آپ کی تلوار و بندوق اور بمب سے نہیں ڈرتا اور ڈرتا ہے تو کس سے۔ آپ کی زبان سے کیوں؟ اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ زبان قومیت کی جان ہے۔ اگر زبان مٹادی گئی تو قوم کی روایات۔ اس کی تہذیب اس کی تاریخ، اس کی قومیت سب کچھ مٹ جائے گا۔

میں آپ کو ایک فاضل یورپین کا قول سناتا ہوں۔ میں سی۔ انڈیا اینگلو انڈین اینڈ یورپین ایجوکیشن بورڈ لینگوایج کمیٹی کا ممبر ہوں اس کمیٹی کے ایک ممبر ایک مشہور مشنری کالج کے پرنسپل بھی ہیں۔ باتوں باتوں میں انھوں نے مجھ سے کہا کہ ایک بات کبھی نہ بھولنا۔ وہ یہ کہ اپنی زبان کی ہر ممکن طریقے سے حفاظت کرنا۔ اس لئے کہ جب ایک قوم کسی دوسری قوم کو فتح کرلیتی یا اس پر غالب آجاتی ہے۔ تو سب سے پہلے وہ مفتوح یا مغلوب قوم کی زبان پر حملہ کرتی اور اُس کے مٹانے کی کوشش کرتی ہے کیونکہ وہ خوب سمجھتی ہے کہ زبان کے مٹ جانے سے قومیت کی روح فنا ہوجاتی ہے۔ جب انگریز راج ہمارے ملک سے اُٹھ گیا تو اب انگریزی کی بجائے ہماری زبان کا راج ہے۔

یوں تو اردو کی مخالفت اسی برس سے مسلسل چلی آرہی ہے حکومت بدلتے ہی نشر و اشاعت کا شعبہ خاص طور پر کوشش کرکے سردار پٹیل صاحب کو دیا گیا۔ اب آپ دیکھ لیجئے کہ یہ کیا زبان ہے؟ آپ کو زحمت تو ہوگی۔ لیکن کبھی کبھی اسے بھی ضرور سن لیا کیجئے تاکہ معلوم ہو۔ یہ کیسی زبان ہے؟ اور کس دیس کی بولی ہے۔ کہیں اور کی ہو یا نہ ہو مگر اس میں مطلق شبہ نہیں کہ سردار پٹیل کے وطن کی بولی تو ہرگز نہیں۔ اس زبان کے اجنبی اور مصنوعی ہونے کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ جب لوگوں نے واویلا مچایا کہ ریڈیو[1] کی یہ زبان سمجھ میں نہیں آتی۔ تو اس کے عجیب الفاظ کی شرح اخباروں میں شائع کی جارہی ہے اور ان کے معنی اردو میں بتائے جا رہے ہیں۔ یہ مزید شہادت اس بات کی ہے کہ اردو عام فہم زبان ہے اور یہ نئی بولی اس ملک کی بولی نہیں۔ اس معاملے میں جس غیر معمولی عجلت سے کام لیا گیا نہایت حیرت انگیز ہے۔ ہر ہر صوبہ پہل کی عزت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ پنڈت شکلا وزیراعظم سی۔ پی نے سب سے پہلے یہ اعلان کیا کہ اس صوبے میں سرکاری

---

[1] اسی جناتی زبان کو سن کر مولانا صفی لکھنوی نے کہا تھا ؎

ہندی زبان اصل گنواری زبان ہے   ہوگی نہ شہریوں میں گزر اس غریب کی
اردو سے آر۔ ایس پنڈت کو کیوں ہے بیر   کیا یہ زبان ہے کسی ان کے رقیب کی

www.taemeernews.com

زبان ہندی ہوگی ناگپور کے وائس چانسلر نے اس کا ساتھ دیا اور ہندی ذریعہ تعلیم قرار پائی۔ میں نے اسی وقت مہاتما گاندھی کو لکھا کہ آپ نے ایک مدت غور و فکر اور مشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ ملک کی عام زبان ہندستانی ہونی چاہیے۔ لہٰذا آپ مہربانی فرما کر سی۔ پی کے وزیر اعظم اور ناگپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو ہدایت فرمائیے کہ وہ ہندی کی بجائے ہندوستانی کو رواج دیں۔ اس کے بعد یو۔پی کی حکومت نے اعلان کیا کہ ہندی حکومت کی دفتری اور عدالتی زبان ہوگی۔ رسم الخط ناگری ہوگا اور صوبے کے تمام سرکاری اور نیم سرکاری محکموں کو اطلاع دی گئی کہ ہندی زبان اور ناگری رسم الخط فوراً جاری کر دیا جائے اور ان سرکاری ملازموں کو جو ہندی نہیں جانتے۔ ہدایت کی گئی کہ وہ تین مہینے کے اندر ہندی سیکھ لیں اور آئندہ کوئی شخص جو ہندی نہیں جانتا ملازمت کا حقدار نہیں ہوگا، مدارس میں ہندی کا پڑھانا لازمی قرار دیا گیا اور ذریعہ تعلیم بھی یہی زبان ہوگی۔ اس سے قطع نظر ایک دیرینہ تجویز جو سالہا سال سے انڈین نیشنل کانگریس کے پیش نظر ہے اور جس کی تائید مہاتما گاندھی بھی فرما چکے ہیں یعنی صوبوں کی تقسیم لسانی اعتبار سے اب تک اسے عمل میں لانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اب حکومت اپنی ہے بظاہر کوئی امر مانع نہیں اور نہ زیادہ دشواری پیش آئے گی۔ اگر یہ تجویز عمل میں آگئی اور ایک نہ ایک دن ضرور عمل میں آکر رہے گی تو ہندستان جنت نشان میں اردو یا ہندستانی کا کہیں ٹھکانا نہ ہوگا۔ گاندھی جی اپنے عبادتی جلسوں میں نیز ریڈیو کی تقریروں میں یہ فرماتے ہیں کہ اردو کو بھی ملک میں رہنے کا ویسا ہی حق ہے جیسا ہندی کو۔ کیوں کہ اس کے بولنے اور جاننے والے صرف مسلمان ہی نہیں ہندو اور سکھ بھی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ ملک کی عام زبان 'ہندستانی' ہونی چاہیے اور دونوں رسم خط (ناگری اور اردو) میں لکھی جائے۔ لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔

سر سید کا ہمیشہ یہ خیال تھا کہ ہندستان کی بھلائی بغیر اس کے کہ ہندو مسلمان بہ طور ایک قوم کے مل جل کر کام کریں ممکن نہیں۔ چنانچہ اس سے قبل ان کی ملکی خدمات اور تحریکیں سب اس اصول پر مبنی تھیں۔ مولانا حالی حیاتِ جاوید میں لکھتے ہیں۔ سر سید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جب کہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بہ طور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔ ان کا بیان ہے کہ انہیں دنوں میں جب یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک روز مسٹر شیکسپیئر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر انہوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا کہ اب مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں۔ بڑھتا نظر آتا ہے جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔ انہوں نے کہا کہ اگر آپ کی پیشین گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے۔ میں نے کہا مجھے بھی نہایت افسوس ہے۔ مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔ آج ہم زندہ ہیں وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

ہمیں خدانخواستہ ہندی سے کوئی عداوت نہیں۔ اور نہ ہم نے کبھی ہندی کی مخالفت کی۔ چھیڑ دوسری طرف سے شروع ہوئی۔ ہم تو کسی حال میں بھی ہندی کی مخالفت نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ ہماری زبان کی بنیاد ہی اسی پر ہے اور یہ ہماری دست پروردہ ہے یہاں تک کہ یہ لفظ بھی ہمارا ہی دیا ہوا ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل یہ تھا ہی نہیں اور نہ ہی اس نام کی کوئی زبان تھی۔ مسلمانوں کی آمد پر

www.taemeernews.com

گرد و پیش کے علاقوں میں یہ بولیاں رائج تھیں۔ پنجابی شمالی حصے میں۔ برج متھرا آگرہ وغیرہ علاقے ہیں۔ راجستانی راجپوتانے میں اودھی یا پوربی مشرق میں بولی جاتی تھی۔ ہندی نام کی کوئی بولی نہ تھی۔ البتہ دلی۔ میرٹھ اور آس پاس کے علاقے میں ایک بولی مروج تھی۔ جیسے امیر خسرو "دہلوی" کہتے تھے اور ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں اُسے "دہلوی" لکھا ہے شیخ باجن (متوفی ۹۱۲ھ) بھی اس کو دہلوی کہتے ہیں ان کے کلام کے کچھ متفرق ٹکڑے ملے ہیں۔ ہندی کا نام فارسی کے امتیاز کرنے کے لئے دیا۔ دوسرے چونکہ مسلمان اس دیس کو ہند کہتے تھے۔ اس لئے اس زبان کا نام بھی دیس کی مناسبت سے ہندی تجویز کیا۔[1]"

"وہ زبان جسے آج کل ہندی کہا جاتا ہے۔ مگر وہ ایسی ہندی ہے کہ جسے نہ شہر والے سمجھتے ہیں نہ دیہات والے۔ غرض اس طرح زبان بھی الگ کر لینے کی کوشش کی گئی۔ یہیں سے اصل تنازع اور نفاق کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ پہلا قدم تھا جو فرقہ پرستی کی طرف اُٹھایا گیا اور وہ فرقہ پرستی جس کے مجرم آج ہم قرار دیئے جاتے ہیں اس کی بنا سب سے اوّل ان حضرات نے اپنے مبارک ہاتھوں سے ڈالی۔ سب سے پہلے اس کا بیج بہار میں بویا گیا۔ اس کے بعد اس کے کلے یو۔ پی میں پھوٹے بنارس اور الٰہ آباد میں سبھائیں قائم ہوئیں اور اس بات کی کوشش شروع ہوئی کہ عدالتوں اور دفتروں میں ہندی کو رواج دیا جائے اس وقت سرسید احمد خاں نے اس نامبارک تحریک کی مخالفت کی اور اردو کی تائید میں مضامین لکھے۔ سرسید نہایت حسرت اور افسوس سے لکھتے ہیں دو تین برس کے عرصے میں مجھ کو ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان خیال پیدا ہوا اور ہمیشہ میری یہ خواہش تھی کہ دونوں مل کر دونوں کی فلاح میں کوشش کریں۔ مگر جب سے ہندو صاحبوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اُردو زبان اور فارسی کو جو مسلمانوں کی حکومت اور اُن کی شاہنشہی ہندوستان کی باقی ماندہ نشانی ہے مٹا دیا جائے۔ اس وقت سے مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ ہندو مسلمان باہم متفق ہو کر ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا کام نہیں کر سکتے۔ میں نہایت درستی اور تجربے اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندو مسلمانوں میں جو نفاق شروع ہوا ہے اس کی ابتدا اسی سے ہوئی۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہا ان کا (سرسید کا) انتقال ہو گیا اور ہندی والوں کی بن آئی۔ پھر ایک اور دور آتا ہے۔ نواب محسن الملک نے جو سرسید کے جانشین تھے۔ اردو کی حمایت پر کمر باندھی۔ لکھنؤ میں ایک بڑا بھاری جلسہ کیا۔ جس میں نواب صاحب نے پُرجوش اور پُرزور تقریر کی اس تقریر کا یہ مصرع اب تک زبان زدِ خاص و عام ہے کہ

عاشق کا جنازہ ہے بڑی دھوم سے نکلے[2]

لیکن سر انٹونی میکڈانل اپنے حکم کی تعمیل پر تُلے ہوئے تھے اور اس کی مخالفت کو اپنی ذاتی مخالفت سمجھتے تھے۔ انہوں نے نواب صاحب کو ڈرایا دھمکایا۔ سب سے بڑی دھمکی یہ تھی کہ اگر تم اس تحریک میں حصہ لیتے رہو گے تو کالج سکرٹری نہیں رہ سکتے۔ کالج کا نقصان انھیں گوارا نہ ہوا اور وہ اس دھمکی میں آ گئے اور صبر کر کے بیٹھ رہے۔ اگر وہ سکرٹری کے عہدے سے مستعفی ہو جاتے اور اپنی ساری ہمت اردو کی ترقی اور اشاعت میں صرف کر دیتے تو ہماری زبان کو بڑی تقویت پہنچتی۔

"ٹنڈن[3] جی نے حیدر آباد کے ایک جلسے میں ارشاد فرمایا کہ دارالترجمہ نے جو کچھ کیا ہے۔ اسے موسیٰ ندی میں تو نہ بہا سکے البتہ اسے

---

[1] اقتباس از خطبات عبدالحق از ص۳۷۷ تا ص۳۸۹ ۔ [2] خطبات عبدالحق ص۴۶۰ ۔ [3] خطبات عبدالحق ص۵۸۴

www.taemeernews.com

آگ لگا کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر لیا۔ حیدر آباد میں بے دردی سے ہماری زبان اور تہذیب کو مٹانے کی کوشش کی گئی۔ اس کا صدمہ ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔"

"ہندو مسلمانوں میں جو نفاق شروع ہوا۔ اس کی ابتدا ۱۸۶۷ء میں بنارس سے ہوئی۔ اور ایسے بُرے وقت ہوئی کہ اب تک ختم ہونے کو نہیں آئی۔ بلکہ دن بدن زور پکڑتی جاتی ہے۔ لیکن اس وقت بھی بعض منصف مزاج اور عاقبت اندیش ہندو اہلِ قلم نے اس نئی تحریک کی مخالفت کی چنانچہ ۱۸۶۹ء میں منشی حکم چند پروفیسر دہلی کالج نے ایک مدلل اور محققانہ مضمون اس کی مخالفت میں لکھا۔ پروفیسر موصوف زبانوں کی حقیقت اور ارتقا وغیرہ پر بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خالص زبان اور میل والی (مخلوط) زبان میں کیا خاص فرق ہے! اور اوّل الذکر کو ثانی الذکر کے مقابلے میں کیوں خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ دنیا میں کوئی زبان بھی ایسی کہی جا سکتی ہے۔ جس میں بدیسی الفاظ شامل نہ ہو گئے ہوں۔ اگر کوئی ایسی زبان موجود ہو تو اس کو ترجیح کی کوئی وجہ نہیں۔ میل والی زبان میں اجنبی الفاظ کچھ عرصے کے استعمال کے بعد کھپ جاتے ہیں اور مقامی رنگ اختیار کر لیتے ہیں اور اس میل والی زبان کو بھی خالص زبان کہہ سکتے ہیں۔ دراصل یہ تمام امور اُردو زبان کی بحث سے خارج ہیں۔ اس واسطے کہ اردو ایک زندہ زبان ہے اور اس قدر زمانے سے ہندوستان میں استعمال کی جا رہی ہے کہ اس کو ترک کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھایا جا سکتا۔ یہ بحث بالکل بے نتیجہ ہے کہ آیا اردو ایک خالص زبان ہے یا اس میں دوسری زبانوں کا بھی میل ہے۔ اب ہندو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اِس جگہ ہندی کو رواج دیں۔ جس کا استعمال عرصے سے ترک کر دیا گیا ہے اور جس کی حیثیت اب ایسی ہی رہ گئی ہے جیسی سنسکرت کی۔ ایک زمانہ تھا جب دلّی والے جامہ پہنا کرتے تھے۔ لیکن اب لوگوں نے یہ لباس ترک کر دیا ہے۔ اگر اب کوئی یہ لباس پہن کر بازار میں جائے۔ تو لوگ کیا کہیں گے؟ اکثر لوگ بہروپ سے تعبیر کریں گے۔ زبانوں کا بھی یہی حال ہے۔ اب اگر آپ "بدن" کی جگہ ("شریر") اور "شیر" کی جگہ ("سنگھ") استعمال کریں، تو لوگ آپ کی زبان سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔ فارسی رسم خط کی جگہ جو ناگری رسم خط استعمال کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس کا بھی یہی حال ہے۔ دراصل اگر ایک دفعہ بدیسی الفاظ کسی زبان میں چل جائیں۔ تو زبان خالص بنانے کے لیے انھیں بے دخل نہیں کیا جا سکتا اور نہ رسم خط بدلا جا سکتا ہے۔[1] شہروں میں ہر چھوٹا بڑا اردو بولتا ہے اور سرکاری دفاتر میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اُردو میں اخبارات کی بڑی تعداد شائع ہوتی ہے اور تعداد میں ہر روز مزید اضافہ ہو رہا ہے۔ اُردو میں دوسری زبانوں کے مطالب بیان کرنے کی بدرجۂ اتم صلاحیت پائی جاتی ہے۔

اسی زمانے میں گارساں دتاسی لکھتے ہیں کہ "باوجود ان مباحث کے جن کی نسبت ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔ اردو ہندوستان کی مشترکہ زبان کی حیثیت سے مسلّم ہے۔ ڈیوک آف اڈنبرا نے اس زبان میں اپنے دورانِ سفر میں تقریریں کیں اور اسی زبان میں ڈیوک موصوف کی تعریف و توصیف میں قصیدے لکھے گئے۔ آجکل ساؤتھ کنزنگٹن میوزیم میں شہزادہ البرٹ کی جو نمائش ہو رہی ہے اس کے نیچے اُردو زبان میں کتبہ[2] لکھا گیا ہے۔"

ڈاکٹر دینی کمار چیٹرجی نے لکھا ہے "یہ زبان 'بنی جی کی بھاشا' کہلاتی ہے۔ اور اسے تقدس کا درجہ حاصل ہے۔ اردو دان

---

[1] خطباتِ عبدالحق صفحہ ۱۲۹ ۔ [2] خطبات عبدالحق صفحہ ۱۳۰ ۔

www.taemeernews.com

اصحاب کا بڑا احترام کیا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ ان کے نکاح نامے اور میلاد اُردو میں پڑھے جاتے ہیں۔ خط اُردو میں ہوتے ہیں۔ عربی مدارس میں ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ جنوبی ہند کے علاقے میسور۔ مدراس۔ ممالک متوسط چھوٹا ناگپور وغیرہ میں اُردو کا بھی احترام ہے۔ اُردو کے ارتقا کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اُردو زبان کی ترقی کی تقریباً تمام تحریکیں ان لوگوں کی رہینِ منت ہیں۔ جن کی زبان اردو نہ تھی یہ ایسٹ انڈیا کے ڈائریکٹر اور حکام تھے۔ جن کی تحریک سے فارسی کی بجائے اردو سرکاری زبان قرار پائی۔ قدیم دہلی کالج میں ڈاکٹر سپرنگر نے تمام قدیم و جدید علوم کا ذریعۂ تعلیم اردو کر دیا اور ان کے جانشین مسٹر بُروس نے اسے اور ترقی دی۔ کرنل ہالرائڈ نے پنجاب میں اُردو کی جو خدمت کی آپ پر روشن ہے۔ سر اکبر حیدری کی مادری زبان گجراتی تھی۔ انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی قائم کرنے میں جو عظیم الشان کام کیا وہ تعریف سے بالاتر ہے[1]:

رائٹ آنریبل سری نواس شاستری نے مدراس میں اپنی ایک تقریر میں فرمایا کہ ہندی ایک روز اس ملک کی قومی زبان بن کے رہے گی۔ یہ ایک نہایت نرم حلیم الطبع اور اعتدال پسند سیاست دان کا قول ہے۔ جب اینٹی میکڈانل۔ گاندھی جی، شاستری جی اور مرار جی جیسے بزرگوں کے ہاتھ میں ہماری زبان کی قسمت کا فیصلہ ہو۔ تو جو نہ ہو کم ہے۔ کچھ دن ہوئے سر تیج بہادر سپرو نے جو اردو کے شیدائیوں میں ہیں بڑے افسوس اور حسرت سے فرمایا۔

"ہندو اُردو چھوڑتے جاتے ہیں۔ اب تک مجھے یہ توقع تھی کہ کایستھ اور کشمیری پنڈت ہمارا ساتھ دیں گے۔ لیکن افسوس وہ بھی ہٹتے جا رہے ہیں، اُردو جو ہندوستان کی تاریخ میں ہندو مسلم اتحاد کی سب سے عظیم الشان اور مبارک یادگار ہے۔ وہ بڑی بے دردی سے فرقہ داری سیاست کی بھینٹ چڑھائی جا رہی ہے[2]"

پنڈت پدم سنگھ شرما نے آل انڈیا ہندی ساہتیہ سمیلن مظفر پور کی تقریر میں بیان کیا" اور شعرا نے حالی کے رنگ کو اپنا لیا ہے بلکہ اسے اور چمکا دیا ہے اردو اخبارات میں دیس بھگتی (حبِ وطن) اور معرفت کی جو نظمیں نکلتی ہیں وہ پڑھنے والے کو اپنی طرف کھینچتی ہیں دل پر اثر کرتی ہیں۔ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ ہندی کی نئی رچناؤں (نظموں) میں یہ بات ابھی نہیں آئی اردو والے شعروں میں جذبات خیالات کا نیاپن بھرتے ہیں[3]"

"پنڈت مالویہ جی نے جب شدھی اور سنگھٹن کے دنگل قائم کیے۔ تو اس کا زور اور بڑھا اور اس مذہبی جنون سے ہندی کی اشاعت کا خوب فائدہ اٹھایا گیا۔ ما سپوتانہ۔ سنٹرل انڈیا کی ہندو ریاستوں میں اس وقت دفتروں اور عدالتوں کی زبان اردو تھی۔ وہاں وفد بھیج بھیج کر اردو کو اکھاڑا اور ہندی کو جمایا۔ ایک بھے پور ان کی گرفت سے بچ رہا تھا۔ اس کا جو حشر ہوا وہ آپ نے دیکھ لیا۔ ایک پنڈت رام چندر شرما نے مرن برت رکھا کہ جب تک تمام ریاست میں اور اس کے دفتروں اور عدالتوں میں ہندی دیوناگری حروف میں جاری نہ ہوگی اور اردو کو دیس نکالا نہ دیا جائے گا۔ میں برت نہیں توڑوں گا۔ اور جان دے دوں گا۔ راجپوتانہ پراونشل ہندو سبھا اور جے پور

---

[1] خطباتِ عبدالحق ص۵۸۔ [2] خطباتِ عبدالحق ص۲۹۲۔ [3] خطباتِ عبدالحق ص۲۵۵

www.taemeernews.com

ہندو سبھا نے اس کی حمایت کی۔ زمین آسمان ایک کر دیا اس قسم کی فاقہ کشی گاندھی جی کی ایجاد ہے۔ گاندھی جی اور ان کی تقلید میں بہت سوں نے برت رکھے لیکن مرا ایک بھی نہیں۔ یہ مرن برت نہیں دھمکی برت ہے اور جس طرح راج کوٹ کے معاملے میں وائسرائے دھمکی میں آ گئے۔ اسی طرح جے پور کے وزیر اعظم بھی دھمکی میں آ گئے۔ سر انٹنی میکڈانل نے ہندو ڈیپوٹیشن کے جواب میں کہا تھا کہ تبدیلی جلد نہیں ہو سکتی۔ لیکن جے پور کے وزیر اعظم نے فرمایا جہاں تک جلد ممکن ہوگا ہندی جاری کر دی جائیگی۔ سر انٹنی کو دیو ناگری جاری کرتے ہیں دو سال لگ گئے مگر جے پور کے وزیر با تدبیر نے چند ہی روز میں حکم ناطق نافذ کر دیا اور بے گناہ اُردو کے قتل کا فتویٰ سر مرزا اسمٰعیل کے دست مبارک سے لکھا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔[1]

"آپ ہی کے اس شہر (ناگپور) میں جب مسز نیڈت تشریف لائیں اور بڑی دھوم سے ان کا استقبال ہوا۔ ان کے اعزاز میں ڈاکٹر کھرے صاحب کی صدارت میں جلسہ ہوا۔ تو مسز پنڈت اور ڈاکٹر کھرے نے کس زبان میں تقریریں کیں۔ کیا وہ کوئی دیہاتی بولی تھی یا ہندی؟ نہیں۔ یہ وہی غریب اردو جس پر آج ہر طرف سے لے دے ہو رہی ہے۔ سبھاش چندر بوس نے یو۔ پی۔ بہار۔ سی پی میں بارہا دورے کئے اور سیکڑوں جلسوں میں تقریریں کیں۔ وہ بڑے مقرر ہیں۔ ہزاروں آدمیوں نے ان کی تقریریں سنیں۔ وہ بنگالی ہیں۔ لیکن وہ سیدھی سادی اُردو میں گھنٹوں تقریر کرتے ہیں اور لوگ بلا تکلف سمجھتے ہیں اور متاثر ہوتے ہیں۔ . . . . . یہ اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ ہندوستان کی اگر کوئی زبان ہے تو وہ اُردو ہی ہے۔"[2]

مشترکہ زبان کے عنوان سے انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ نے ایک کتاب ۱۹۵۰ء میں شائع کی تھی۔ جس کا دیباچہ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا تھا۔ اس کی ضخامت ۲۰۷ صفحات ہے اور ٹائپ میں چھپی ہے۔ اس کتاب میں اُردو، ہندی اور ہندستانی زبان کے متعلق ان کے خیالات قلم بند کئے گئے۔ اردو کے متعلق مسٹر گاندھی نے کیا سوچا۔ اور اس زبان کے متعلق انہوں نے مختلف اوقات میں کیا کہا۔ ایک عنوان ہندستانی۔ ہندی اور اُردو ہے۔ فرماتے ہیں:

"ہندی اُردو[3] کے سوال پر سخت بحث چل پڑی ہے اور ابھی چل رہی ہے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ جہاں تک کانگریس کا تعلق ہے ہندستانی ہی وہ بھاشا ہے۔ جسے اس نے انتر صوبائی تعلق کے لیے باضابطہ تمام بھارت کی بھاشا منظور کیا ہے۔ ورکنگ کمیٹی کے حال کے پرستاد سے اس سمبندھ کے سارے وہم دور ہو جانے چاہئیں۔ جن کانگریس والوں کو سارے ہندوستان میں کام کرنا پڑتا ہے وہ اگر دونوں لکھاوٹوں میں ہندستانی سیکھنے کی تکلیف اٹھائیں تو اپنی سب کی پسند کی بھاشا کی منزل کی طرف ہم بہت کچھ آگے بڑھ جائیں کیونکہ اصل جھگڑا ہندی اور اردو میں نہیں۔ بلکہ ہندستانی اور انگریزی میں ہے۔ وہی سخت مقابلہ ہے۔ میں تو اس کے لئے بھی یقینی طور پر بہت فکر مند ہوں۔ ہندی اردو بحث کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ ہندستانی کے بارے میں کانگریس کی جو رائے ہے اس کو بھی اصلی شکل ملنی ہے۔ اور ایسا تب تک نہ ہوگا۔ جب تک کانگریس کی کاروائی صرف ہندستانی میں نہ ہونے لگے گی۔ کانگریس والوں کے فائدے

---

[1] خطبات عبدالحق صفحہ ۲۹۔ [2] خطبات عبدالحق صفحہ ۱۰۱ [3] مشترکہ زبان صفحہ ۲

www.taemeernews.com

کے لئے کانگریس کو ہندستانی کے لغت بنانے پڑیں گے اور ایک ایسا محکمہ کھولنا پڑے گا۔ جو ان لغتوں کے علاوہ کام میں آنے والے نئے نئے شبد مہیا کرے گا۔ کام بہت بڑا ہے لیکن اگر ہمیں درحقیقت سارے ہندستان میں چالو ایک زندہ اور بڑھتی ہوئی بھاشا کو پیدا کرنا ہے۔ تو ایسا کرنا ہی چاہیے۔ یہ محکمہ اس بات کا فیصلہ کرے گا کہ اردو یا دیوناگری لپیوں میں لکھے ہوئے موجودہ ساہتیہ کے گرنتھوں اور ماہانہ ہفتہ واری اور روزانہ پرچوں میں سے کن کن کو ہندستانی سمجھا جائے۔ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ جس میں کامیابی پانے کے لئے بڑی محنت کی ضرورت ہے۔

ہندستانی کی اصل شکل دینے کے لئے ہندی اور اُردو کو اس کی پالنے والی بھاشائیں سمجھنا چاہیئے۔ اس لئے کانگریس والوں کو ان دونوں کی طرف اچھے وچار رکھنے چاہئیں اور جہاں تک بن سکے ان دونوں کے ہی نزدیک رہنا چاہیے۔ ایک ترقی یافتہ راشٹر کی ہر ایک ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اس ہندستانی کو بہت سی بول چال کے شبد مہیا کرنے پڑیں گے۔ بنگال یا دکن کے سننے والوں کے سامنے جو ہندستانی بولی جائے گی۔ اس میں قدرتی طور پر سنسکرت پیدا ہوئے شبدوں کا دخل ہو گا۔ وہی بات جب پنجاب میں کہی جائیگی تو اس میں عربی فارسی سے پیدا ہوئے شبدوں کی کافی ملاوٹ ہوگی۔ یہی حال ان کے سننے والوں کے سامنے ہوگا۔ جن میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوگی جو سنسکرت سے بنے ہوئے بہت سے شبد نہیں سمجھ سکتے۔ اس لئے جن لوگوں کو سارے ہندستان میں تقریریں کرنی پڑتی ہیں ان کے پاس ہندستانی لفظوں کا ذخیرہ ایسا ہونا چاہیے جس کی مدد سے بھارت کے سب ہی حصوں کے سننے والوں کے سامنے وہ بنا کسی جھجک کے بول سکیں۔ پنڈت مالوی جی اس بات میں سب سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ میں جانتا ہوں، سننے والوں کو چاہیے ہندی بولنے والے ہوں یا اردو بولنے والے اپنی طرف مخاطب کرنے میں انھیں کبھی مشکل نہیں پڑتی کسی ٹھیک لفظ کے لئے میں نے انھیں کبھی بھٹکتے نہ پایا یہی بات بابو بھگوان داس کی ہے جو اپنی تقریروں میں ہر طرح کے بول چال کے لفظوں کا استعمال کرتے ہیں اور اس بات کا دھیان رکھتے ہیں کہ ان میں سے کوئی ناموزوں تو نہیں۔ یہ لکھتے وقت مسلمانوں میں محمد علی کا خیال آتا ہے۔ جن کے پاس دونوں ہی طرح کے سننے والوں کے لئے کافی طرح کے لفظوں کا ذخیرہ تھا۔ اس سے انھیں کافی فائدہ ہوا۔ کانگریس سے آزاد رہ کر ہندی اور اردو برابر ترقی کرتی رہیں گی۔ ہندی زیادہ تر ہندوؤں میں اور اُردو مسلمانوں میں محدود رہے گی۔ درحقیقت ہندی جاننے والے ایسے مسلمان بہت کم ہیں جنھیں اسکا پنڈت کہا جا سکے۔ حالانکہ میں یقین کرتا ہوں کہ ہندی بولنے والے حصوں میں پیدا ہونے والے مسلمانوں کی مادری زبان ہندی ہی ہے۔ اسی طرح ایسے ہزاروں ہندو ہیں جن کی ماتری بھاشا اردو ہے اور ان میں سے سیکڑوں ایسے بھی ہیں جنھیں اُردو کا پنڈت کہا جا سکتا ہے۔ پنڈت موتی لال نہرو ایسے ہی تھے، ڈاکٹر تیج بہادر سپرو کی نسبت بھی ہم یہی کہہ سکتے ہیں۔ ایسی مثالیں اور بھی بہت مل سکتی ہیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ان دو بہنوں میں کوئی جھگڑا یا حسد ہو۔ ہاں پریم بھرا رشک تو ہمیشہ ہونا ہی چاہیے۔ میرے پاس جو کچھ حالات آئے ہیں۔ ان سے تو ایسا معلوم پڑتا ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب کے زیر اہتمام عثمانیہ یونیورسٹی اردو کی بڑی سیوا کر رہی ہے۔ اس یونیورسٹی میں اردو کا ایک بہت بڑا خزانہ ہے۔ سائنس کی بھی کتابیں اردو میں تیار کی جا رہی ہیں۔ چونکہ اس یونیورسٹی میں ایمانداری کے ساتھ اردو کی تعلیم دی جا رہی ہے اس لیے اس کی ترقی ہونی چاہیے بلا وجہ کسی تعصب کی وجہ سے اگر آج ہندی بولنے والے ہندو وہاں کے بڑھتے ہوئے ساہتیہ سے فائدہ نہ اٹھائیں۔ تو یہ ان کا قصور ہے۔ لیکن اس تعصب کا انت تو یقینی ہے کیونکہ دونوں جاتیوں کے بیچ کی موجودہ نااتفاقی

www.taemeernews.com

تمام بیماریوں کی طرح کچھ تھوڑی دیر کی مہمان ہے اچھا ہو یا بُرا پر یہ دونوں جاتیاں تو ہندوستان کی ہو چکی ہیں اور ایک دوسرے کی پڑوسی ہیں اور اس دیش کی سنتان ہیں۔ یہیں وہ پیدا ہوئے ہیں اور یہیں مریں گے۔ اس لئے اگر وہ خود بخود ہی من سے نہ رہنے لگے تو قدرت اس کے لئے انھیں مجبور کرے گی جو حال ہندوؤں کا ہے وہی مسلمانوں کا ہے۔ اگر مسلمان ہندو ُساہتیہ سمیلن' اور 'ناگری پرچارنی سبھا' کی نرم کوششوں کے نتیجے کا فائدہ نہ اٹھائیں تو یہ ان کا قصور ہے یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ سمیلن نے ہندی کی یہ تعریف کرکے کہ وہ بھاشا جو اتر بھارت میں ہندو مسلمانوں کے ذریعہ بولی جاتی ہے اور جو اُردو یا ناگری لکھاوٹ میں لکھی جاتی ہے۔ (اپنی طرف سے) جو بڑا قدم اٹھایا ہے۔ مسلمانوں نے فخر اور خوشی کے ساتھ اس کی داد نہیں دی ہے۔ اسی طرح جہاں تک بیان کا تعلق ہے کانگریس نے ہندستانی کی جو تشریح کی ہے۔ اس کے ساتھ اس کا میل بیٹھ جاتا ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ ایسے بھی کچھ لوگ ہیں۔ جو اس بات کا سپنا دیکھتے ہیں کہ یہاں خالی اردو یا خالی ہندی ہی رہے گی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ ناپاک سپنا ہے اور ہمیشہ سپنا ہی رہے گا۔

(ہریجن سیوک ۲۹ اکتوبر ۱۹۳۸ء)

ہندستانی کا سانچہ کے ایک عنوان سے ہریجن مورخہ ۲۸ اپریل ۱۹۴۶ء میں بھی گاندھی جی نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

"ہریجن کے مختلف نام ہیں۔ ہندستانی زبان میں اُسے 'ہریجن سیوک' کہتے ہیں اور اس کے گجراتی اڈیشن کا نام 'ہریجن بندھو' ہے۔ ہندستانی بھاشا جب صرف ناگری لکھاوٹ میں لکھی جاتی تھی تو اس کا نام ناگری تھا اور معلومہ وجوہ کی بنا پر وہ ہندستانی زبان ہے اور رسم الخط میں ناگری اور اُردو۔ کوشش یہ کی جائے گی کہ ایسی ہندستانی زبان پیدا کی جائے۔ جو نہ سنسکرت کے سانچہ میں ڈھالی ہوئی ہندی ہو اور نہ فارسی زبان کے سانچے میں ڈھالی ہوئی اُردو۔ رہی یہ بات کہ ہندستانی زبان عام پسند ہوگی یا نہیں تو اس کا انحصار جتنا ہندستانی ہریجن میں لکھنے والوں پر ہے اتنا ہی پڑھنے والوں پر ہے۔" (ہریجن اردو رسم الخط)

مشہور مصنف جناب محمد الیاس برنی اردو۔ ہندی۔ ہندستانی کے معرکے میں فرماتے ہیں:

"جس زبان میں رامائن جیسی شاعری ہو اس کی ادبیت میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ اور یوں بھی ہندی میں ادب کا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ خاص کر محبت و اخلاق کے بیان میں اس کا رنگ بہت دلکش ہے اور اس کی تشبیہات و تمثیلات تو فطرت کی تصویریں معلوم ہوتی ہیں۔ پھر کلام میں بحروں کا جو وسیع اہتمام ہے اس میں موسیقی کی بہت گنجائش رہتی ہے۔ راگ راگنیاں خوب جمتی ہیں۔ کھلتی ہیں اور موسیقی سے نظم کا اثر گہرا پڑتا ہے۔ غرض کہ ہندی ادب قابل مطالعہ ہے۔ ہندی کو نظر انداز کرنا تنگ نظری ہے پھر اردو کی توسیع و ترقی کے سلسلے میں لسانی اعتبار سے ہندی کا مطالعہ صرف مفید ہی بلکہ ضروری ہے۔ پس ہندی کے مطالعہ پر بھی توجہ کی ضرورت ہے اعلیٰ معیار نہ سہی اوسط یا کم از کم ابتدائی واقفیت بھی کارآمد ہو سکتی ہے۔

لیکن ہندستان کی جو زبان اندرونِ ملک و بیرونِ ملک سب سے زیادہ بولی جاتی ہے۔ سمجھی جاتی ہے وہ وہی ہے جو 'اردو' کہلاتی ہے اور تناسب مختلف ملک کی بیشتر زبانوں کا مجموعہ ہے۔ چنانچہ ہندی عنصر تو صاف ظاہر ہے۔ پس اردو کی وسعت، جاذبیت اور جامعیت کا انکار ہے۔ پھر اس میں ادب کے علاوہ علوم و فنون کا اس میں نمایاں اضافہ ہو رہا ہے چنانچہ اس وقت ہندوستان میں بلحاظ توسیع و ترقی کوئی زبان اردو کے ہم پلہ نظر نہیں آتی۔

بریں ہمہ اردو کے مقابل ہندی کے رواج کی بحث جو ملک میں پھیل رہی ہے۔ گویا دونوں زبانوں میں رقابت پیدا ہو رہی ہے

www.taemeernews.com

مصالحت کے مدِ نظر ملک کی عام زبان کا ایک تیسرا نام 'ہندستانی' تجویز ہوا ہے۔ جس میں گویا اُردو ہندی دونوں زبانیں بقدرِ مناسب شامل ہیں اگر اس سے یہ مراد ہو کہ اردو میں ہندی کا عنصر موجودہ تناسب سے بڑھایا جائے۔ جو یہ تحریک اُردو میں پہلے سے جاری ہے اور تقویت پا رہی ہے۔ لیکن اگر مقصد یہ ہے کہ ہندستانی کے نام سے اردو کے بجائے سنسکرت کی ہندی رائج کی جائے۔ تو یہ دوسرا ہے اور اصل مقصد کے منافی بلکہ منافی ہیں اردو ہندی کے بجائے مصلحتاً ہندستانی زبان تسلیم ہو جانے کے بعد بھی حروف کی بحث باقی رہ جاتی ہے جس میں رسم الخط کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کا بھی مصلحت آمیز حل پیش کیا جاتا ہے کہ اردو ہندی رسم الخط ساتھ ساتھ حسبِ موقع محل استعمال ہوں۔ لیکن ہندی کے حامی جو دراصل اردو کے بجائے ہندی رائج کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس سمجھوتہ پر راضی نہیں ہیں۔ بلکہ ان کو ہندی رسم الخط پر اصرار ہے۔ خیر اصرار بھی لیکن لطیفہ یہ کہ وہ ہندی حروف کو اردو حروف پر فنی لحاظ سے فائق بتاتے ہیں۔ جو علی یہ ہے کہ اس دعوے کا شدومد سے اعلان ہوتا رہتا ہے، جس کی بدولت عام مغالطہ پھیل رہا ہے۔ حتیٰ کہ حامیانِ اردو بھی اس مغالطے کا شکار پائے گئے کہ ہندی حروف میں تلفظ تحریر و ترکیب کے لحاظ سے جامعیت، سہولت اور باقاعدگی ہے اور گویا اُردو حروف میں یہ بات نہیں ہے۔ حالانکہ واقعہ بالکل برعکس ہے۔ اردو حروف تلفظ میں، تحریر میں، ترکیب میں اکثر اعتبار سے ہندی حروف کے مقابل فنی فوقیت رکھتے ہیں۔ اول تو اردو کے مقابل ہندی حروف کی مجموعی تعداد ڈیوڑھی ہے یعنی پچاس فی صد زیادہ دوسرے حروف کی اشکال و علامات کی تعداد کا فرق اس سے بھی زیادہ ہے یعنی اُردو کے مقابل سہ چند۔ اُردو حروف کی متعدد صاف اور واضح آوازیں ہندی میں نادر ہیں اور ہندی کی جو بعض آوازیں اردو میں کم ہیں وہ ایسی دقیق یا رقیق ہیں کہ خود ہندی میں وہ باعثِ تکلف محسوس ہوتی ہیں اور باعثِ دشواری مانی جاتی ہیں۔ اُردو سے زیادہ ہندی میں حروف کے تلفظ متشابہ ہیں۔ جن سے تحریر میں پیچیدگی بڑھ جاتی ہے۔ پھر ہندی حروف کی شکلیں بھی طولانی اور پیچیدہ ہیں۔ جن کے لکھنے میں زیادہ دقت اور جگہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مزید برآں متعدد شکلیں متشابہ ہیں۔ جو سرسری تحریر میں بآسانی اشتباہ پیدا کرتی ہیں۔ سب سے بڑھ کر ہندی حروف کی ترکیبیں ہیں — (سنیوگ) کہ ایک طرف تلفظ میں وہ بہت دقیق یا رقیق ہوتی ہیں۔ تو دوسری طرف تحریر میں ان کے جوڑ بہت مختلف محل بلکہ مختلف نئی نئی شکلیں اختیار کرتے ہیں نتیجہ یہ کہ لکھنے پڑھنے میں حیرانی لاحق ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی منزل میں جبکہ عبارت سادہ ہو ہندی کا لکھنا پڑھنا آسان معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جوں جوں عبارت کا معیار بڑھتا جاتا ہے۔ تلفظ میں، تحریر میں، ترکیب میں حروف کی دقت اور پیچیدگی معمول سے بہت زیادہ بڑھتی ہے۔ حتیٰ کہ اوسط درجے میں وہ خاص غور طلب بن جاتی ہے اور اعلیٰ عبارت میں تو حرفوں کا تلفظ، حرفوں کی تحریر اور حرفوں کی ترکیب اچھے اچھوں کو حیران کر دیتی ہے۔ چنانچہ معنی مطالب کے قطع نظر سنسکرت بلکہ ہندی کی اعلیٰ مذہبی اور علمی عبارتیں بلحاظ زبان صحیح لکھنا پڑھنا خاص مہارت کی بات ہے اور جس ہندی کو رواج دینا مقصود معلوم ہوتا ہے وہ سنسکرت کی ہندی ہوگی تو لامحالہ حروف کی خصوصیات عبارت میں بافراط نمایاں ہوں گی۔ ہندی حروف کے ان ہی تحقیقاتی امور پر غور کرنے کی غرض سے چند سال پہلے ماہرین کی ایک کمیٹی مقرر ہوئی تھی جس نے غالباً رپورٹ بھی تیار کی تھی لیکن شاید وہ ہندی رسم الخط کے موافق نہ تھی اور اس میں فنی لحاظ سے ہندی حروف کی کوتاہیاں اور دشواریاں تفصیلاً پیش کی گئی تھیں۔ ہندی کے حامیوں نے اس رپورٹ کی عام اشاعت مناسب نہ سمجھی اور وہ یوں ہی روپوش ہوگئی۔ ورنہ اس کی اشاعت سے بہت کچھ مسائل واضح ہو جاتے۔ اک زمانے میں اس کمیٹی

www.taemeernews.com

کا چرچا رہا۔ لیکن مزید کیفیت تحقیق نہ ہو سکی۔"

(اقتباس اردو ہندی رسم الخط صفحہ (۱۰-۱۵) مطبع اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن)

نئی دہلی کے سری موہن آنند کا ایک خط نیشنل ہیرالڈ لکھنؤ میں یکم اکتوبر ۱۹۶۱ء کو شائع ہوا ہے۔ یہ خط شمالی ہند کی عام زبان کے بارے میں غلط رجحانات کی جرأت مندانہ تنبیہہ ہے۔

جناب والا! کہا جاتا ہے کہ وزیراعظم پنڈت نہرو نے کانگریس کے ایک حالیہ جلسے میں کہا کہ ہندی بولنے والی ریاستیں پچھڑی ہوئی ہیں۔ اگرچہ انہوں نے جلدی سے یہ بھی کہہ دیا کہ "میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ ہندی پچھڑا پن لاتی ہے۔" لیکن ان کی بات نے جنتا کی توجہ اس سوال کی طرف موڑ دی کہ کیا کسی علاقے کے پچھڑے پن سے زبان کو کچھ تعلق ہے اور اگر ہے تو اس کا کیا سبب ہے۔

نئی ہندی کا اپنی موجودہ صورت میں نویں صدی تک وجود نہ تھا تلسی داس اور سورداس کے عظیم شعری کارنامے اودھی اور برج بھاشا کی مقامی بولیوں میں تھے۔ جن کا کوئی اپنا نثری اسلوب نہ تھا۔ پندرھویں صدی میں نثر کا صرف ایک مسلمہ اسلوب تھا اور وہ تھی فارسی خط میں لکھی ہوئی کھڑی بولی۔ اس کا رقبہ اتنا وسیع تھا کہ شمالی ہند کے تقریباً سبھی شہر اس میں شامل تھے اور وہ پھیل کر دکن تک پہنچی اور اس زبان نے شہروں کے مہذب لوگوں کے لئے اپنے خیالات ایک دوسرے تک پہنچانے کا وسیلہ بہم پہنچایا اور ترقی کے نظم و نسق و تجارت اور کاروبار کی زبان بن گئی۔ دیہات کے خواندہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد بھی اس زبان کو سمجھنے اور پڑھنے لگی۔ یہ زبان برابر ترقی کرتی رہی یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آخری حصے میں آریہ سماج تحریک اُٹھ کھڑی ہوئی جس کا نعرہ تھا۔ ویدوں کی طرف پلٹ چلو۔ ہندو قوم کو متحد کرنے کے جوش میں یہ تحریک ایک گئے گزرے زمانے کی عظمت کے راگ الاپنے لگی۔ آریہ سماجیوں کے خیال میں اس عظمت کی بازیافت کا واحد طریقہ یہ تھا کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیانی دَور کے اثرات کو دور کیا جائے۔ ویدوں کا مطالعہ اور دیوناگری رسم الخط کی ترویج جس میں وید لکھے ہوئے تھے۔ آریہ سماجیوں کے پروپگنڈے کے خاص مقصد بن گئے اور بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ پروپگنڈا فارسی حرفوں میں لکھی ہوئی اردو ہی میں کیا جاتا تھا۔ پنجاب میں ہندی کے حامی آج بھی فارسی حرفوں میں لکھی ہوئی اردو ہی کے ذریعے اُردو اور گرومکھی کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔

آریہ سماجیوں کا کہنا تھا کہ کوئی زبان جو بدیسی خط میں لکھی جاتی ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی عام فہم کیوں نہ ہو۔ ہندو قوم کو قبول نہ کرنا چاہیے اور زندگی کے ویدی طریقے اختیار کرنا چاہیے۔ ہندی کا تحفظ ہندو کلچر اور مادرِ ہند کے تحفظ کا لازمی جز سمجھ لیا گیا ہے ...... اب بہت کم لوگوں کو یاد ہوگا کہ شمالی ہند میں ہندی تحریک کے اصلی مزاج سے ناواقفیت کی حالت میں مہاتما گاندھی اس صدی کی تیسری دہائی میں ہندی ساہتیہ سمیلن میں شریک ہو گئے تھے، لیکن انہوں نے جلد ہی اس تحریک کا مطلب سمجھ لیا اور سمیلن سے اپنا قطع تعلق کر لیا۔ یہ زیادہ تر ہندی خطرے کا توڑ تھا کہ مہاتما گاندھی ہندی کے مقابلے میں فارسی اور دیوناگری دونوں خطوں میں لکھی ہوئی ہندستانی کو مقبول بنانے لگ گئے۔ بدقسمتی سے سیاست نے ایسے پلٹے کھائے کہ ہندستانی کی تحریک اپنے بانی کے ساتھ تہ تیغ کر دی گئی۔

www.taemeernews.com

وزیر اعظم نے ان کے پچھڑے پن کا ذکر کرکے اس علاقے کے اونگھتے ہوئے لوگوں کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے۔ حقیقتاً اپنی زبان کے ساتھ ساتھ ہی ترقی کر سکتی ہے اور اگر ہندی کو ترقی کرنا ہے تو اس کو اپنے رجعت پسند ماضی سے علیحدہ ہونا پڑے گا۔ اس کے لئے ضرورت ہے پُر جوش مصنفوں کے ایک گروہ کی۔ (اردو زبان اور اس کا رسم الخط از صفحہ ۹۱ تا ۹۲ مصنفہ مسعود حسن رضوی ادیب طبع نظامی پریس وکٹوریہ سٹریٹ لکھنؤ)

انجمن حمایت اسلام لاہور کے اجلاس منعقدہ ۱۲ اپریل ۱۹۳۶ء میں مولوی عبدالحق "بابائے اردو" نے خطبہ صدارت جو پیش کیا تھا۔ اس میں رسم الخط سے متعلق چند نکات ملتے ہیں۔

"اس ضمن میں رسم الخط کا مسئلہ بھی آجاتا ہے۔ آج کل اس پر بڑی پُر زور بحث ہو رہی ہے جن میں سے بعض دلچسپ اور کار آمد ہیں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی تان اردو رسم خط ہی پر کیوں توڑی جاتی ہے۔ یہ مسئلہ ہندوستان کے تمام رسوم خط سے متعلق ہے۔ جہاں متعدد اور مختلف تحریر کے طریقے رائج ہیں خصوصاً جنوبی ہند میں جس کا تعلق نہ اردو رسم خط سے ہے نہ دیوناگری سے۔ ہندوستان کی تمام زبانوں کیلئے کسی ایک رسم خط کا ہونا ممکن تو ہے لیکن اس کا عمل میں آنا بہت دشوار ہے۔ شملہ میں آپ کو ایک پُر لطف لطیفہ سناؤں۔ مسٹر ہری گوپال ٹائپ حروف اور اس کی طباعت کے بڑے ماہر ہیں۔ انہوں نے حال میں بنگالی اور ہندی کا ٹائپ تیار کیا ہے۔ جو بہت قابل قدر ایجاد ہے۔ انہوں نے رسالہ "دشارد" "وشال بھارت" کلکتہ میں دیوناگری رسم خط کی تائید میں ایک مفصل مقالہ لکھا ہے۔ جس کے ضمن میں انہوں نے یہ بحث کی ہے کہ مسلمان جو کہتے ہیں کہ دیوناگری رسم خط اختیار کرنے سے ان کے کلچر کو صدمہ پہنچے گا۔ یہ بالکل غلط خیال ہے۔ رسم خط کو کلچر سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بحث کرتے کرتے وہ رومن خط پر آتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ رومن رسم خط اختیار کرنے سے ہندو تہذیب اور کلچر کو سخت نقصان پہنچے گا۔ کیا عجیب بات اور کیسی عجیب منطق ہے۔ قابل مقالہ نویس کو "حافظہ نباشد" کا الزام نہیں دیتا لیکن اتنا ضرور عرض کرتا ہوں کہ دلوں کی تہوں میں جو بات چھپی ہوئی تھی۔ اس کا راز کس سادہ لوحی سے طشت از بام ہو گیا۔ جب تک اس خیال اور دماغ کے لوگ ہم میں موجود ہیں خواہ وہ کسی طبقے یا فرقے کے ہوں اس وقت تک ملک کی ساری زبانوں کے لئے کسی ایک رسم خط کا ہونا محال ہے۔

رہا اردو رسم خط تو یہ آج کا نہیں ہے۔ جب سے یہ زبان پیدا ہوئی یہ اس کے ساتھ ہے۔ اور یہ زبان جیسا کہ معلوم ہے اور ظاہر ہے ہیئت ملکی زبان ہے۔ ہندو مسلمانوں کی مشترکہ ملک ہے۔ دونوں کو اس کے بزرگوں سے میراث میں ملی ہے اور یہ رسم خط بھی اسی کے ساتھ آیا ہے۔ جسے دونوں یکساں طور پر استعمال کرتے رہے اور کرتے ہیں اور اس میں ایک کو دوسرے سے شکایت کا موقع ہی نہیں، ہاں یہ ممکن ہے کہ ایک وقت ایسا آئے کہ جب ہندوستان کی سب زبانوں کا رسم خط ایک ہو جائے۔ لیکن اس وقت کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کب آئے گا اور اس کی کیا صورت ہوگی۔ البتہ یہ میں مانتا ہوں کہ فی الحال اصلاحِ رسم کا مسئلہ قابلِ غور اور نہایت ضروری ہے؟"

(خطباتِ عبدالحق صفحہ ۴۲-۴۳)

اُردو۔ ہندی۔ ہندستانی۔ ہندی ہندستانی اور رسم خط کے متعلق ایک طویل معرکہ مختلف کتابوں اور رسالوں میں ملتا ہے۔ گاندھی جی نے پہلے اردو اور ہندی کو ہندستانی نام دینے کی تجویز پیش کی تھی۔ پھر "ہندی ہندستانی" کا نام ان کی مختلف تحریروں میں ملتا ہے۔ رسم الخط کی بحث میں بھی گاندھی جی کے خیالات کے مثبت پہلو نمایاں ہیں۔ اس ضمن میں چند دوسرے دانشوروں کے

www.taemeernews.com

نکات بھی قابلِ قدر ہیں۔ جن سے اس مسئلہ کے مثبت اور منفی دونوں رجحانات کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ ہندو اور مسلم دونوں قوم کے رہنما اپنے اپنے خیالات کا اظہار فرماتے ہیں۔ چند کٹر قسم کی شخصیتیں بھی شامل ہیں بعض زعماخدا لگتی کہتے ہیں اور نہایت جرأت مندانہ لائحہ عمل کی تلقین کرتے ہیں۔ ہمیں کہتے میں یہ باک نہیں کہ اردو ہندی کا نزاع دو قومی نظریہ کا موید رہا بلکہ اس نظریہ کا ایک حد تک تقویت کا موجب بھی بنا رہا۔

---

www.taemeernews.com

اُردو، ہندی اور ہندستانی

معرکہ آرا: بابائے اُردو مولوی عبدالحق، مہاتما گاندھی، منشی پریم چند۔
ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری۔ بابو راجندر پرشاد، پروفیسر محمد مجیب

بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی اصل حقیقت اپنے ایک مضمون میں بیان فرمائی ہے۔ یہ مضمون کلیم دہلی بابت جولائی ۱۹۳۶ء کے صفحہ ۸۹، ۹۰ پر موجود ہے۔ چونکہ اس انجمن کا ذکر اکثر و بیشتر مختلف اہلِ قلم نے اپنے اپنے مقالات میں کیا ہے۔ اس لئے اس کا تعارف ذیل میں درج ہے۔ اردو ہندوستانی کے سمجھنے میں اس سے کافی مدد مل سکتی ہے۔

" بہت سے اصحاب اس جملے کے معنی نہیں سمجھیں گے اور اس عنوان کو پڑھ کر انھیں الجھن ہوگی اس لئے سب سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس کے معنی ہیں" ہندوستان بھر کی ادبیات کی انجمن" اس کا پہلا اجلاس ۲۴، ۲۵ اپریل کو ناگپور میں ہوا مہاتما گاندھی اس کے صدر تھے۔ انھیں تاریخوں میں ہندی ساہتیہ سمیلن کے اجلاس بھی مختلف اوقات میں وہیں ہوئے۔ اس کے صدر بابو راجندر پرشاد تھے۔ اس سے قبل کہ میں پرشد کے اس اجلاس کے حالات بیان کروں۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس کی 'شانِ نزول' سے مختصر طور پر بحث کروں یعنی یہ کہ یہ انجمن کن وجوہ سے وجود میں آئی۔ اس کا مقصد کیا ہے۔ جب تک یہ نہ کیا جائے گا اس کی پوری حقیقت سمجھ میں نہ آئے گی۔

مسٹر کاکا کالیلکر اس اجلاس کی مجلس استقبالیہ کے صدر تھے انہوں نے اپنے ایڈریس میں بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی پیدائش کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہاں لکھتا ہوں۔ کیونکہ ان کا بیان زیادہ مستند سمجھا جائے گا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ۱۹۱۹ء میں مہاراشٹر ساہتیہ سمیلن منعقدہ بڑودہ میں سب سے پہلے یہ خیال پیدا ہوا۔ اس کے بعد کولہاپور کے اجلاس میں مہاراجہ بڑودہ نے بھارت ساہتیہ پرشد کا خاکہ بہت پُرزور طریقے پر پیش کیا پھر کراچی میں کانگریس کے موقع پر مسٹر کنہیا لال منشی سے جو میری بات چیت ہوئی تو اس میں بھی ہم نے ایک ایسی سوسائٹی کی ضرورت کو محسوس کیا پچھلے سال جب اندور میں ہندی ساہتیہ سمیلن کا اجلاس مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہوا اور ہم سب ایک جا جمع ہوئے تو ایک مفصل تجویز اس کے متعلق مسطور کی گئی۔ جسے عمل میں لانے کے لیے مسٹر کنہیا لال منشی، ہری ہر شرما اور گرودھا شرما کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ ہندی ساہتیہ سمیلن کے چند مہینے کے بعد مہاراشٹر ساہتیہ سمیلن کا اجلاس بھی اندور میں ہوا۔ اس نے بھی کولہاپور کے تخیل کے عمل میں لانے کے لیے ہندی ساہتیہ سمیلن سے تبادلہ خیالات کیا۔ ہندی ساہتیہ سمیلن نے کاکا کالیلکر، ہری بھاؤ، پادھیائے اور بابا راگھوداس کو اندور بھیجا۔ اندور مہاراشٹر ساہتیہ سمیلن نے اپنی ساہتیہ پرشد کو اطلاع دی کہ بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے لیے ایک مہاراشٹر کمیٹی قائم کی جائے۔ جو ہندی ساہتیہ سمیلن کو بھارتیہ ساہتیہ سمیلن قائم کرنے میں مدد دے۔ اسی طرح کرناٹک اور گجرات کی ساہتیہ سمیلنوں نے بھی اس تحریک کو سراہا۔

www.taemeernews.com

یہ تو ہے اس کی پیدائش اور ابتدا کی حقیقت اب رہا اس کا مقصد سو وہ اس قرارداد سے ظاہر ہے۔ جو ناگپور کے اجلاس میں منظور کی گئی۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :۔

اس پرشد کا اُدیش (مقصد) ہو گا کہ

(الف) ہندوستان کی سب پرانتوں کی بھاشاؤں کے ساہتیوں (ادبوں) اور ساہتکاروں (ادیبوں) میں آپس میں میل کرانا اور اس نام سے بھارتیہ ساہتیوں کی ترقی اور پھیلاؤ میں مددگار ہونا۔

(ب) اس سبھا کا نام ہندی یعنی ہندوستانی ہو گا۔

اُس کمیٹی نے جو اس انجمن کے مقاصد کی تکمیل کے لیے مقرر کی گئی تھی۔ پہلا کام یہ کیا کہ ماہانہ "ہنس" کو جو کئی سال سے ملک کے قابل ادیب منشی پریم چند صاحب کی ایڈیٹری میں جاری تھا۔ اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا اور اب اُسے پرشد کا رسالہ بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے اور منشی پریم چند صاحب کے ساتھ گجراتی زبان کے ادیب اور مورخ مسٹر کنہیالال منشی بھی اسی کی ایڈیٹری میں شریک ہو گئے ہیں۔

اس مختصر تمہید کے بعد جو بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی پیدائش اور مقاصد کے متعلق تھی میں آپ کو اس کے پہلے اجلاس کی روداد سنانا چاہتا ہوں جو ہم سب کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہے۔

۲۴ اپریل ۱۹۳۱ء کو تقریباً دس بجے دن کے اس کا پہلا اجلاس شروع ہوا۔ سب سے اوّل مسٹر کاکا کالیلکر نے اپنا اڈریس پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعد صدر انجمن مہاتما گاندھی کا مطبوعہ ایڈریس جو صرف ایک صفحہ کا تھا تقسیم کر دیا گیا اور مہاتما جی نے یہ کہہ کر کہ مطبوعہ ڈریس پڑھ کر سنانا فضول ہے اور آپ خود پڑھ لیں۔ زبانی تقریر شروع کر دی۔ یہ ایسی آہستہ آواز میں تھی کہ پاس والے بھی اچھی طرح نہ سن سکے۔

پرشد کے اس جلسے کا سب سے بڑا کارنامہ وہ ریزولیوشن تھا۔ جسے میں اوپر نقل کر چکا ہوں۔ زیادہ تر بحث اس پر رہی۔ اس کے پہلے جزو سے کسی کو اختلاف نہ تھا۔ البتہ دوسرے جزو پر سب کچھ گفتگو رہی۔ اصل مسودہ میں یہ الفاظ تھے کہ اس پرشد (انجمن) کی ساری کارروائی ہندی ہندوستانی میں ہو گی۔ یہ لفظ پہلی بار سننے میں آیا تھا۔ غالباً یہ مہاتما گاندھی کی جدت پسند دماغ کا نتیجہ تھا۔ میں نے مہاتما جی سے کہا کہ انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے ریزولیوشن میں یہ طے کیا تھا کہ اس ملک کی زبان ہندوستانی ہو گی۔ خواہ وہ ناگری حروف میں ہو یا فارسی حروف میں، اس کے بعد آپ نے ہنس کے متعلق جو تحریر شائع کی۔ اس میں آپ لکھتے ہیں کہ اس رسالے کے مضامین کی زبان ہندی اتھوا (یا) ہندوستانی ہو گی۔ اس کے کیا معنی؟ فرمانے لگے کہ کانگریس کا ریزولیوشن بھی میں نے ہی بنایا تھا۔ میں نے عرض کیا۔ یہ صحیح ہے لیکن اس وقت ہندوستانی کے معنی ہم ہرگز ہندی نہیں سمجھے تھے۔ کہنے لگے کہ اب میں نے اس کے معنی بتا دیئے ہیں جو ہنس کی تحریر میں آپ نے دیکھے۔ یہ مہاتما گاندھی کی محض زبردستی ہے۔ یہ انہوں نے ایک نیا لفظ ایجاد کیا ہے یعنی "ہندی ہندوستانی" جو بالکل بے معنی ہے۔ یہی لفظ پرشد کی مجلس استقبالیہ کے صدر کاکا کالیلکر صاحب نے اپنے ایڈریس میں استعمال کیا تھا معلوم ہوتا ہے کہ ان صاحبوں نے پہلے سے یہ طے کر لیا تھا کہ ہندوستانی کا لفظ تنہا استعمال نہ کیا جائے" تاکہ اس کی گنجائش ہی باقی نہ رہے کہ ہم میں سے کوئی شخص اس کا مفہوم "اردو" لے سکے۔ جب گاندھی جی سے سوال کیا گیا کہ ہندی ہندوستانی سے آپ کا کیا مطلب ہے۔ فرمایا وہ ہندی جو آگے چل کر ہندوستانی ہونے والی ہے۔ اس پر اعتراض کیا گیا یہ تو کوئی زبان نہ ہوئی۔ یہ تو آپ کی خواہش یا منشا ہے۔ اس سوال کے جواب میں کہ ہندی کونسی زبان ہے؟

www.taemeernews.com

اور ہندوستانی کونسی ، مہاتما نے فرمایا کہ ہندی ادبی زبان ہے جو عام لوگ کم سمجھتے ہیں اور ہندوستانی وہ زبان ہے جو عام لوگ بول چال میں استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ابھی اس کا ادب نہیں بنا۔ اپنے مطبوعہ ایڈریس میں انہوں نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ ہندی کو ہندوستانی کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اس بھاشا میں   ان فارسی الفاظ کو جو زبان میں رائج ہو گئے ہیں ترک نہ کیا جائے۔ غرض صبح کا جلسہ اس پر ختم ہو گیا اور کوئی بات طے نہ ہوئی۔

سہ پہر کے جلسے میں پھر یہی بحث چھڑ گئی۔ جب مہاتما جی سے کہا گیا کہ ریزولیوشن میں یا تو آپ ہندی کا لفظ رکھئے یا ہندوستانی کا "ہندی ہندوستانی" کے کوئی معنی نہیں۔ تو فرمایا کہ ہم فیصلہ کر چکے ہیں اور میں ہندی کو نہیں چھوڑ سکتا" مجھے ہندی سمیلن کے ساتھ چلنا ہے میں نے کہا کہ آپ نیشنل کانگریس کے فیصلے کے ساتھ ساتھ کیوں نہیں چلتے۔ جس نے قطعی فیصلہ کر دیا تھا کہ ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی میں نے دانستہ دوبارہ یہ بات اس لیے کہی تھی کہ صبح کی گفتگو کے وقت پنڈت جواہر لال نہرو موجود نہ تھے۔ اس وقت وہ میرے قریب تشریف رکھتے تھے اور خیال تھا کہ وہ بحیثیت صدر کانگریس کے ضرور میری تائید کریں گے لیکن مجھے افسوس اور کس قدر مایوسی ہوئی کہ انہوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور خاموش بیٹھے رہے اور ایک نہیں وہاں اکٹھے تین کانگریس کے صدر موجود تھے۔ (دو سابق اور ایک حال) مگر کوئی ٹس سے مس نہ ہوا۔ گاندھی جی نے میرے سوال کے جواب میں وہی کہا جو صبح فرما چکے تھے۔ اس کے بعد جب یہ گفتگو بڑھی تو گاندھی جی نے "ہندی ہندوستانی" کو بدل کر "ہندی یعنی ہندوستانی" کے الفاظ رکھ دیئے۔ اس پر اختر حسین رائے پوری نے ترمیم پیش کی کہ ریزولیوشن میں یا تو لفظ ہندی رکھا جائے یا ہندوستانی۔ کیونکہ مہاتما جی خود ہندی اور ہندوستانی کے دو الگ الگ مفہوم بتا چکے ہیں۔ اس بنا پر ہندی اور ہندوستانی ایک زبان نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے ہندی یعنی ہندوستانی بے معنی ہوگا۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک لفظ رکھنا مناسب ہوگا۔ میں نے یہاں تک کہا کہ آپ صرف ہندی رکھئے اور میں اس کی تائید کروں گا۔ اس پر وہ ہنسنے لگے اور کہا یہ نہیں ہو سکتا۔ آخر مہاتما جی نے ووٹ پر آمادگی ظاہر کی۔ مسٹر کنہیا لال منشی نے کہا کہ یہ معاملہ ادبی اور لسانی ہے ووٹ سے طے نہیں ہونا چاہیے۔ مہاتما جی نے کہا کہ ووٹ کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ فیصلہ کی یہی ایک تدبیر ہے۔ ووٹ کا حکم صادر ہوا۔ لیکن ووٹ لینے سے پہلے بڑی ہوشیاری یہ کی گئی کہ ہندی سمیلن کے ان نمائندوں کو بھی ووٹ کا حق دے دیا گیا۔ جو اس وقت اس جلسے میں حاضر تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کثرت رائے اس ترمیم کے خلاف نکلی۔ اگر ہندی سمیلن کے نمائندوں کو ووٹ کی اجازت نہ دی جاتی۔ جس کا انھیں حق حاصل نہ تھا۔ تو ترمیم غالباً منظور کرنی پڑتی۔ مگر مہاتما گاندھی بھارتیہ ساہتیہ پرشد کو ہندی سمیلن کا بچہ سمجھتے ہیں اور ان کے تصور میں یہ دو مجلسیں بھی الگ نہیں ہونے پاتیں حالانکہ بقول منشی پریم چند کے یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ پہلے دن کی کارروائی یہیں ختم ہو گئی۔

اصل معاملہ تو پہلے ہی دن طے ہو چکا تھا۔ دوسرے دن ۲۵ اپریل کو ایک معمولی جلسہ ہوا۔ پہلے دن سہ پہر کو ایک گفتگو چھڑ گئی تھی کہ ہمیں اپنی زبانوں کے ادب کا رخ بدلنا چاہیے۔ بار بار پرانے فرسودہ خیال مضامین کو دوہرانا موجودہ حالات کے بالکل منافی ہے ہمیں اپنے ادب کو زندہ اور زندگی کے حالات کے مطابق بنانا چاہیے۔ اس بحث میں پنڈت جواہر لال نے بھی حصہ لیا اور یہ ارادہ ہوا کہ دوسرے روز ایک ریزولیوشن اس مضمون کا پیش کیا جائے۔ کنہیا لال منشی اور دو ایک اور صاحب اس خیال کی مخالفت کرتے رہے کہ پرشد کے مہارتھیوں نے اس خوف سے کہ کہیں جدید خیال والے کوئی سخت ریزولیوشن پیش نہ کر دیں رات ہی کو اس مضمون کا ایک ہلکا سا

www.taemeernews.com

ریزولیوشن تیار کیا اور دوسرے روز اجلاس شروع ہوتے ہی پہلے اسے پڑھ کر سنایا جو بلا اختلاف منظور کر لیا گیا۔ لیکن یہ ریزولیوشن بہت کچھ تصریح کا محتاج تھا۔ اس لیے ان صاحبوں نے جو دیسی ادبیات کی اصلاح پر مصر تھے۔ ایک الگ بیان شائع کیا۔ اس کے بعد انتظامی کمیٹی کے ارکان کا انتخاب ہوا۔ ان میں سے چند تو ہندی ساہتیہ سمیلن نے اپنے حق کی بنا پر اپنے نمائندے انتخاب کیے اور کچھ مہاراشٹر ساہتیہ سمیلن نے اور چند متفرق اشخاص منتخب ہوئے۔ بھارتیہ پرشد کے پہلے اجلاس کی کارروائی ختم ہوئی۔

اب اس کارروائی پر میں مختصر سا تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے یہ دیکھ لیا کہ ہندوستانی کو ہندی میں اور ہندی کے معنی ہندوستانی بنانے میں پھر "ہندی ہندوستانی" کی جدید لفظ کے اختراع میں اور آخر میں ہندی یعنی ہندوستانی کے الفاظ میں کیسے کیسے پہلو بدلے ہیں۔ پہلے اردو کا لفظ ترک کر کے ہندوستانی اختیار کیا گیا۔ یہاں تک کچھ مضائقہ نہ تھا اور اس پر ہم بھی رضامند تھے اور ہمارے بعض مستند ادیبوں اور اہل الرائے اصحاب نے یہ لفظ لکھنا شروع کر دیا تھا۔ بلکہ ان کا اصرار تھا کہ اُردو کی بجائے اب ہندوستانی لکھا جائے اور اس پر ایک حد تک عمل بھی ہونے لگا تھا۔ فریقین نے سمجھوتہ تسلیم کر لیا تھا۔ اب ہندوستانی کا لفظ بھی متروکات میں داخل ہو گیا اور صرف ہندی رہ گیا۔ معترض کے لئے ان کے پاس جواب موجود ہے۔ وہی جو گاندھی جی نے فرمایا۔ "ہندی یعنی ہندوستانی" گاندھی جی نے رسالہ ہنس کی زبان کو بھی ہندی اتھوا ہندوستانی فرمایا ہے۔ جب ان سے کہا گیا کہ ہنس کی زبان بہت کٹھن ہے وہ ہندوستانی نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی زبان کلکتہ کے مشہور رسالہ وشال بھارت سے بھی زیادہ مشکل ہے تو انھیں حیرت ہوئی۔ ہنس کے ایڈیٹر نے تو صاف صاف لکھ دیا ہے کہ "اب ہندی ملکی زبان کی صورت اختیار کر کے خاص و عام کی زبان ہو چکی ہے۔ مہاتما گاندھی جیسے ملک کے سدھارنے والے اسے زندہ ملکی زبان بنانے کا عہد کر چکے ہیں"۔

اس کی تائید بابو راجندر پرشاد کے اس خطبۂ صدارت سے بھی ہوتی ہے۔ جو انہوں نے ہندی ساہتیہ سمیلن میں پڑھا تھا۔ اس میں انہوں نے بھارتیہ ساہتیہ پرشد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ "خوشی کی بات ہے کہ اس کمیٹی کی کوشش سے بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے۔ اور اس کا پہلا اجلاس اس ناگپور میں مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہو رہا ہے۔ اس کے ذریعہ سے ایک فائدہ یہ ہو گا کہ ہندی کے پرچار کے متعلق ہمیں مدد ملے گی"۔

کاکا کالیلکر صاحب نے بھی اپنے ایڈریس میں صاف طور پر اس کا اعلان کیا ہے فرماتے ہیں"۔ جن لوگوں نے اس تحریک (بھارتیہ ساہتیہ پرشد) کی ابتدا کی ہے۔ انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ہمارا سارا کاروبار راشٹر بھاشا (قومی زبان) ہندی ہندوستانی میں چلے گا ہماری کوشش ہے کہ تمام ہندوستان کی بھاشاؤں کی ابجد ایک ہی ہو اور سب میں "ناگری رسم خط جاری ہو جائے" تاکہ وہ اپنے صوبے کی زبان کا کام "ناگری میں کریں"۔

یہ الفاظ ایسے صاف اور صریح ہیں کہ ان کے لیے کسی دلیل و حجت کی ضرورت نہیں۔ بھارتیہ ساہتیہ پرشد کا یہ مقصد بے شک قابلِ تعریف ہے کہ وہ دیسی زبانوں کے ادبیات کی اصلاح و ترقی چاہتی ہیں۔ لیکن اس کا دوسرا مقصد بلاشبہ ہندی زبان کا پرچار ہے جس میں وہ اور ہندی سمیلن دونوں متفق ہیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ پرشد کے اجلاس کی "تاریخیں اور مقام بدل کر اسے انھیں ایام میں اور اُسی مقام میں رکھا گیا۔ جن تاریخوں میں اور جہاں ہندی سمیلن کا اجلاس تجویز ہوا تھا" تاکہ ہندی سمیلن کے اثر اور امداد سے مستفید ہو سکے

www.taemeernews.com

غرض یہ کہ پرشد ادبیات کے مسئلے سے گزر کر زبان کی اشاعت پر آگئی اور مختلف زبانوں کے ادیب اور ادیبوں کے اتحادِ عمل سے ہندی کے پرچار کا مقصد حاصل کرنا چاہتی ہے۔

اس ضمن میں میں اس امر کا اظہار ضروری خیال کرتا ہوں کہ منشی پریم چند صاحب شروع سے آخر تک ہمارے ساتھ رہے اور وہ اس تمام گفتگو اور بحث سے بددل ہی نہیں تھے بلکہ برہم بھی ہوئے ان کی دلی تمنا تھی کہ ہندی اُردو کے جھگڑے کو مٹا کر کوئی صورت پیدا کی جائے جو دونوں فریقوں میں مقبول ہو سکے لیکن جو کارروائی وہاں ہوئی اس سے وہ بھی ایسے ہی مایوس ہوئے جیسے ہم میں سے بعض لوگ۔

اس گفتگو میں بنگال، مہاراشٹر اور جنوبی ہند کے بعض علاقوں کے نمائندوں نے یہ کہا اور غالباً ان کا کہنا ایک حد تک درست ہے کہ ہندی میں سنسکرت کے الفاظ قائم رکھنا یا داخل کرنا ضروری ہے کیونکہ ان سنسکرت لفظوں کا سمجھنا ہمارے لئے زیادہ آسان ہے بہ نسبت ان ہندی اور فارسی لفظوں کے جو آپ کی سہل ہندی میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ ہماری زبانوں میں پہلے ہی سنسکرت الفاظ بکثرت موجود ہیں ان زبانوں کی بنیاد زیادہ تر سنسکرت پر ہے۔ اس خیال کی تائید کاکا کالیلکر کے اڈریس سے ہوئی تھی۔ جس میں وہ فرماتے ہیں "میں اہلِ دکن کی طرف سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ ہم کو آپ کی (یعنی شمالی ہند کی) ہندی سمجھنے میں مشکل پڑتی ہے پنڈت جواہر لال کی ہندی آپ کے لئے عام فہم ہوگی۔ مگر ہمارے لئے کٹھن ہے۔ وہ ہندی بھی جو دلی اور لکھنؤ کے بازاروں کے گنوار لوگ سمجھ سکتے ہیں وہ نیچرل ہندی ہے لیکن اسے بھی ہم بہت ہی کم سمجھتے ہیں۔ کانگریس میں جو ہندی بولی جاتی ہے اس میں فارسی شبدوں کی اس قدر بھرمار ہوتی ہے کہ دیہات سے آنے والے نمائندوں کے لیے انگریزی اور ہندی دونوں بھاشائیں یکساں مشکل ہو جاتی ہیں۔"

میں ایک بات کہنی بھول گیا وہ یہ کہ پہلے دن کے اجلاس میں پروفیسر محمد مجیب (جامعہ ملیہ دہلی) کا ایک خط انگریزی زبان میں مہاتما گاندھی کے نام چھپا۔ یہ خط نہایت معقول اور مدلل ہے اور بہت ادب اور خلوص سے مہاتما گاندھی جی سے یہ اپیل کی ہے کہ "وہ نیشنل کانگریس کے فیصلے پر قائم رہیں جس نے ملک کی زبان "ہندوستانی" قرار دی ہے۔ انہوں نے مہاتما جی کی اندور والی تقریر نیز ہنس والی تحریر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ جن میں ہندی یا ہندوستانی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اور ہندی کے معنی ہندوستانی قرار دیئے ہیں۔ جو درست نہیں۔ اردو یا ہندوستانی سے بالکل قطع نظر کی گئی۔ بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے قائم ہونے اور ہنس کے جاری ہونے سے ان کو بہت خوشی ہوئی ہے کہ یہ مشترکہ اور عام زبان بنانے میں مضبوط بنیاد کا کام دیں گے، لیکن ہنس کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ اس میں زیادہ تر سنسکرت آمیز ہندی کا استعمال کیا گیا ہے اور اس کی زبان دوسرے ہندی رسالوں کی زبان سے مشکل ہے۔ مجیب صاحب ساہتیہ پرشد کے ساتھ بھارت کے لفظ کو بھی پسند نہیں کرتے کیونکہ اس لفظ کا مفہوم آریائی ہندوستانی ہوتا ہے اور اس سے نہ صرف مسلمان اور ان کی تمام کوششیں جو ہندی زندگی بنانے میں صرف ہوئیں بلکہ صدہا سال کے تغیرات اور ارتقائی منازل جو ہم نے طے کئے ہیں وہ بھی خارج ہو جاتے ہیں۔ ان کی رائے میں بھارت کی بجائے ہندوستانی کا لفظ زیادہ مناسب ہوتا۔ مجیب صاحب نے ایک بات اور بھی لکھی ہے جو صحیح معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ عربی اور سنسکرت میں اصطلاحی الفاظ کا بہت بڑا خزانہ ہے۔ لیکن ہماری عام اور مشترکہ زبان کو ان میں سے کسی پر بھی منحصر نہیں کرنا چاہیے۔ عربی اگر غیر زبان ہے۔ تو سنسکرت بھی اس ملک میں کبھی عام طور پر نہیں بولی جاتی

www.taemeernews.com

تھی جو لوگ ہندی زبان سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہندی میں سنسکرت کے الفاظ اصلی حالت میں نہیں پائے جاتے۔ تلفظ کی سہولت نے ان کی صورتوں کو کچھ کا کچھ کر دیا ہے۔ مثلاً گرام کا گاؤں ہو گیا ورش کا برس۔ اب پھر اصل سنسکرت الفاظ کی طرف رجوع کرنا اور مروجہ الفاظ کو ترک کرنا یا اظہار شخیت ہے یا جہل یا تعصب پر مبنی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ حضرات اس زندہ زبان کی اشاعت سے کچھ سروکار نہیں رکھتے جو عام طور پر بولی جاتی ہے بلکہ انھیں ہندی زندگی کو آریائی بنانے کی فکر ہے۔ مجیب صاحب نے اس خط کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو مسٹر کنہیا لال منشی نے عاقل صاحب (جامعہ ملیہ) کے خط کے جواب میں تحریر فرمایا تھا اس میں مسٹر منشی لکھتے ہیں کہ گجراتیوں، مرہٹوں، بنگالیوں اور کرالیوں نے جن روایات پر اپنی ادبی زبان کو بنایا ہے ان میں اردو کا عنصر تقریباً معدوم ہے۔ مجیب صاحب اسے تسلیم نہیں کرتے، وہ لکھتے ہیں کہ اس میں مطلق شبہ نہیں کہ گجراتی مرہٹی اور بنگالی زبانوں میں فارسی الفاظ کی بہت بڑی تعداد موجود ہے اور میں ہرگز اس امر کے ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ انھیں آپس میں ایک دوسرے سے نیز مسلمانوں سے قریب آنے کے لئے اپنی زبانوں کو سنسکرت آمیز بنانے کی ضرورت ہے۔ علاوہ اس کے صرف خالص اردو عنصر سے ہمیں بحث نہیں بلکہ ہماری بحث شمالی ہند کی زندہ زبان اور محاورات سے ہے اگر یہ زندہ زبان مشترکہ زبان کی بنیاد قرار دی جائے۔ تو مسلمان پوری طرح اس کا ساتھ دینے کے لئے آمادہ ہیں لیکن سنسکرت کی طرف رجعت کرنے کے یہ معنی ہیں کہ وہ مسلمانوں اور ان کی تمام خدمات جو انھوں نے ہندی بنگالی اور گجراتی کے حق میں کی ہیں ناقابل لحاظ ہیں۔ ان حالات میں ہم سے شرکت کی درخواست کرنا گویا ہماری ہلاکت خود ہماری شرکت کی استدعا کرنا ہے۔"

اس کے بعد پرشوتم لال ٹنڈن کی اس تقریر کا ذکر کیا۔ جو انھوں نے الہ آباد میں ہندی میوزیم کے افتتاح کے وقت فرمائی تھی اور جس میں انھوں نے یہ کہا تھا کہ "چینی زبان کے بعد ہندی ایشیا میں سب سے زیادہ بولی جاتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ عام اور مشترکہ زبان کا سوال طے ہو گیا یعنی وہ زبان ہندی ہوگی۔ کیونکہ ہندوستان میں اسی زبان کے بولنے والے سب سے زیادہ تعداد میں ہیں ہندوستانی کے حامی کسی گنتی میں نہیں۔ یہ فرقہ وارانہ تصفیہ کی طرح ایک نئے فتنے کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے۔

خط کے آخر میں پروفیسر مجیب نے چند امور خاص طور پر مہاتما جی کے غور کے لیے پیش کئے ہیں اور ان سے التجا کی ہے کہ اگر وہ مناسب سمجھیں تو عام اعلان کی بنیاد کا کام دے سکتے ہیں اور وہ امور یہ ہیں :-

۱۔ ہماری مشترکہ زبان ہندوستانی کے نام سے موسوم ہوگی نہ کہ ہندی کے نام سے۔

۲۔ ہندوستانی کو کسی فرقے کے مذہبی روایات سے مطلق کوئی تعلق نہ ہوگا۔

۳۔ لفظ کا معیار اس کا رواج ہوگا نہ کہ اس کا دیسی یا بدیسی ہونا۔

۴۔ تمام وہ الفاظ جو اردو کے ہندو اہل قلم نے اور ہندی کے مسلمان مصنفوں نے استعمال کئے ہیں مروجہ الفاظ تسلیم کئے جائیں۔

۵۔ اصطلاحی الفاظ خاص کر سیاسی اصطلاحات کے انتخاب میں سنسکرت کی اصطلاحات کو ترجیح نہ دی جائے بلکہ اردو ہندی اور سنسکرت کی مصطلحات کے فطری انتخاب کی بھی گنجائش رکھی جائے۔

۶۔ دیوناگری اور عربی رسم خط دونوں مسلّم خیال کئے جائیں اور ان تمام اداروں میں جن کی پالیسی ہندوستانیوں کے حامیوں کے ہاتھ میں ہو۔ دونوں خطوں کے سکھانے کی سہولت بہم پہنچائی جائے۔

www.taemeernews.com

میں نے خط کا خلاصہ بیان کر دیا ہے پورا خط پنڈت جواہرلال صاحب نے پڑھ کر سنایا اس پر کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ اور خط داخل دفتر ہو گیا البتہ پنڈت جواہرلال نہرو نے یہ فرمایا کہ تعجب ہے کہ مجیب صاحب جیسے تعلیم یافتہ شخص کو ٹنڈن صاحب کے بیان پر اعتراض ہے۔ ان کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا۔ ان کا کیا مطلب تھا مجھ میں نہ آیا۔ جس خلوص اور امید اور لجاجت کے ساتھ یہ خط مہاتما گاندھی کی خدمت میں لکھا گیا تھا۔ اس کا تقاضا یہ تھا کہ مہاتما جی اس بارے میں اپنا کوئی خیال ظاہر فرماتے اور جو بدگمانی ان کے اور ان کے رفقا کے رویہ سے پیدا ہو گئی ہے اسے رفع کرتے۔ لیکن افسوس انہوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے ہندی کے پرچار اور اسے قومی زبان بنانے کا تہیہ کر لیا ہے۔

اجلاس کے دوران جب زبان کی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ مہاتما گاندھی نے ایک ایسی بات کہی جسے سن کر بے حد تعجب اور افسوس ہوا۔ انہوں نے فرمایا کہ "اردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا۔ مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں۔"

حیرت ہے کہ جس شخص کی صحبت میں مدتوں مولانا محمد علی مرحوم، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر محمود ایسے لوگ رہے ہوں وہ اپنی زبان سے ایسی بات نکالے جو سراسر غلط، بے بنیاد اور بے اصل ہے۔ میں ہر چند یہ توجیہہ کر کے تسلی کرنا چاہتا ہوں کہ مہاتما گاندھی نے یہ بات ناواقفیت کی بنا پر کہی ہے لیکن دل نہیں مانتا۔

مہاتما جی اپنی تقریر میں ہندی اردو یا ہندوستانی کی بحث میں بار بار ہندو اور مسلمان کے لفظ استعمال کرتے تھے۔ میں نے ایک آدھ دفعہ ٹوکا کہ یہ ہندو مسلم سوال نہیں ہے بلکہ بحث ہندی اردو یا ہندوستانی کی ہے۔ ہزارہا ہندو ایسے ہیں جن کی زبان اردو ہے اور اردو کے ادیب ہیں اسی طرح ہزاروں مسلمان ہیں جو ہندی بولتے اور لکھتے ہیں۔ اس لئے بحث کو فرقہ وارانہ رنگ نہیں دینا چاہیے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی جی کا دماغ اور خیال انحطاط پذیر ہو رہا ہے۔ اسی ضمن میں میں نے گاندھی جی سے یہ بھی عرض کیا کہ مہاتما جی آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اردو زبان میں ہندی کے الفاظ اور محاورے جس کثرت سے ہیں خود ہندی زبان میں اس قدر نہیں۔ یہ سن کر گاندھی اور دوسرے صاحبوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے کہا کہ میں نے اس پر خوب غور کیا ہے اور میں اپنے اس دعوے کو ثابت کر سکتا ہوں۔ گاندھی جی نے فرمایا: "یہ کیوں کر ہوا؟"

میں نے کہا: "اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو زبان کی بنیاد عوام کی زبان پر ہے۔ جو اس وقت بولی جاتی ہے۔ اور اس لیے اس میں وہ تمام ہندی لفظ اور محاورے آ گئے جو عام لوگوں کی زبان پر تھے۔ ہندی زبان کتابی ہے۔ عوام کی بولی سے اسے بہت کم سابقہ رہا ہے۔ اسے جب کسی لفظ کی ضرورت ہوتی ہے تو سنسکرت کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے اردو ہندی کی نسبت زیادہ ہندی ہے۔

ایک دن وہ تھا کہ مہاتما گاندھی نے ہندوستانی یعنی اردو زبان اور فارسی حروف میں اپنے دستِ خاص سے حکیم اجمل خان کو خط لکھا تھا اور آج یہ وقت آ گیا ہے کہ اردو تو اردو وہ تنہا ہندوستانی کا لفظ بھی سننا اور لکھنا پسند نہیں کرتے۔ انہوں نے اپنی گفتگو جو برسرِ اجلاس تھی۔ ایک بار نہیں کئی بار فرمایا کہ "ریزولیوشن میں تنہا ہندوستانی کا لفظ رکھا گیا تو اس کا مطلب اردو سمجھا جائے گا۔" لیکن ان کو

www.taemeernews.com

نیشنل کانگریس کے ریزولیوشن میں تنہا ہندوستانی کا لفظ رکھتے ہوئے یہ خیال نہ آیا۔

آخر اس قلب ماہیت (CHANGE OF HEART) کی کیا وجہ ہے کون سے ایسے نئے اسباب رونما ہوئے ہیں جو اس حیرت انگیز انقلاب کا باعث ہوئے۔ غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس تمام تغیر و تبدل، جوڑ توڑ اور داؤ پیچ کا باعث ہمارے ملک کا بدنصیب پالیٹکس ہے۔ جب مہاتما گاندھی اور ان کے رفقا کو یہ توقع تھی کہ مسلمانوں سے کوئی سیاسی سمجھوتہ ہو جائے گا۔ اس وقت تک وہ ہندوستانی ہندوستانی پکارتے رہے جو ٹھیک کر سلانے کے لیے اچھی خاصی لوری تھی اور جب انھیں اس کی توقع نہ رہی یا انہوں نے ایسے سمجھوتے کی ضرورت نہ سمجھی تو ریا کی چادر اتار پھینکی اور اصلی رنگ میں نظر آنے لگے۔ وہ شوق سے ہندی کا پرچار کریں وہ ہندی نہیں چھوڑ سکتے۔ ہم بھی اردو نہیں چھوڑ سکتے۔ ان کو اگر اپنے وسیع ذرائع اور وسائل پر گھمنڈ ہے تو ہم بھی کچھ ایسے ہیٹے نہیں۔

ایسی صورت میں ہمارے لئے اس کے سوا اب کوئی چارہ باقی نہیں رہا کہ ہم اپنی زبان کے بچانے اور اس کی اشاعت و ترقی کے لئے کمر بستہ ہو جائیں۔

اُردو اور ناگری رسمِ خط

معرکہ آرا: مہاتما گاندھی، ڈاکٹر عبدالحق، پنڈت جواہر لال نہرو، محمد الیاس برنی۔
راجگوپال اچاریہ، ملک محمد جائسی، عبدالقدوس ہاشمی، پروفیسر مسعود حسن رضوی

ہر زبان اپنے پسندیدہ رسمِ خط سے پہچانی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا لگاؤ ہے جسے فطری کہنا بجا ہے۔ البتہ جس طرح زبان میں زمانے کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ اسی طرح رسمِ خط بھی اپنی پہلی حالت پر قائم نہیں رہتا۔ اس میں بھی تغیر و تبدل کا ہونا لازمی ہے۔ چنانچہ رسمِ خط میں بھی فطری ارتقا کا عمل جاری و ساری رہتا ہے اور کافی غور و خوض کے بعد ایسی شکل اختیار کرلیتا ہے جو اس زبان کے لیے جزوِ لاینفک کی حیثیت رکھتا ہے۔ فارسی رسمِ خط کی بنا حسن بن حسین علی نے ڈالی۔ وہ چوتھی صدی میں عماد الدولہ دیلمی یا عضد الدولہ دیلمی کا کاتب تھا۔ اس نے خطِ رقاع[۱] اور توقیع[۲] سے ایک نیا خط وضع کیا جسے تعلیق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ برِصغیر پاک و ہند میں سب سے پہلے ۳۶۶ھ میں میر باقر فرد الکمالین آئے جو خوش نویسی میں وحید العصر اور علومِ عقلی و نقلی میں اپنے زمانے کے مشاہیر میں شمار ہوتے تھے۔ پھر ۹۵۶ھ میں خواجہ سلطان علی تشریف لائے۔ یہ بادشاہ ہمایوں کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد شاہجہان کے دور میں آقا عبدالرشید دیلمی ۱۰۳۸ھ میں آئے۔ یہ میر عماد کے بھانجے اور خوش نویسی کی سلطنت کے بے تاج بادشاہ تھے۔ ان کی شہرت عام ہوگئی اور ان کے شاگردوں کی اس قدر کثرت ہوگئی کہ خوش نویسانِ سلف کے نام پردۂ گمنامی میں چلے گئے۔ شہر شہر میں جگہ جگہ ان کے شاگردوں کی وجہ سے خطِ نستعلیق[۳] رائج ہو گیا اور ملک کا ہر طبقہ بلا امتیازِ مذہب و ملت اس فن سے دلچسپی لینے لگا۔ یہ خط نسخ اور تعلیق کو ملا کر پیدا کیا گیا۔ نستعلیق خط میں تکلّف اور نزاکت ہے۔ اس کی چند سطریں گھنٹوں میں لکھی جاتی ہیں۔ چنانچہ اس وقت کے پیشِ نظر حاکمِ ہرات مرتضیٰ قلی خان شاملو نے سنہ ۱۱ھ میں ایک نیا خط وضع کیا جسے خطِ شکستہ کہتے ہیں۔ اصل میں یہ خطِ نستعلیق کی مختصر صورت

۱۔ چھ خطوں میں سے ایک خط کا نام ہے جس کے موجد ابنِ مقلہ خوش نویس تھے۔ یہ خط چھوٹے چھوٹے پرزوں رقعوں پر لکھا جاتا تھا

۲۔ توقیع۔ ایک خط کا نام ہے جس کے موجد ابراہیم الشجری کے بھائی یوسف تھے۔ مامون رشید کے وزیر فضل بن سہیل نے اس خط کو بہت پسند کیا تھا۔ ۳۔ تعلیق لغت میں لٹکانا اور کسی چیز کو کسی دوسری شے سے متعلق کرنے کو کہتے ہیں۔ عربی رسمِ خط عجم پہنچا تو حسن بن حسین علی فارسی نے اسے وضع کرکے رائج کیا۔

۳۔ نستعلیق: امیر تیمور کے زمانے (۷۷۱-۸۰۱ ہجری) میں خواجہ میر علی تبریزی نے خط ایجاد کیا جو (مخفف نسخ و تعلیق) کہلاتا ہے

www.taemeernews.com

ہے۔ اس خط کے اختیار کرنے کا منشا زود نویسی تھا۔ اگرچہ اس نئے خط میں لکھے گئے حروف کے دائرے اور شوشے قدرے ٹوٹے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لیکن ایسے یہ ٹوٹے ہوئے حروف بھی ایک خاصی دلکشی کے حامل نظر آتے ہیں۔ یہ خط شاہی فرامین، کاروباری مراسلت اور خانگی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بہت جلد رائج ہو گیا اور برصغیر پاک و ہند میں اپنی سحر انگیزی سے اس قدر مقبول ہوا کہ شرفا کی کثیر تعداد اسی خط میں مراسلت کرنے لگی۔

جب ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاط سے اردو زبان کی داغ بیل پڑی تو ہندو اس کو ناگری خط میں اور مسلمان اس خط کو فارسی خط میں لکھنے لگے۔ اردو میں بہت سے الفاظ عربی و فارسی کے تھے جن کی آوازیں مخصوص تھیں ان مخصوص آوازوں کو ظاہر کرنے کے لیے دیوناگری میں نشانات نہ تھے۔ چنانچہ اُردو زبان کو اس خط سے فطری مناسبت بھی تھی۔ اس لیے اسی کو اختیار کر لیا گیا۔ اردو حروفِ تہجی کی تعداد ۲۷ ہے جب کہ اس کے مقابلے میں ہندی حروف کی تعداد ۵۳[ل] ہے جو اردو سے تقریباً ڈیوڑھی ہے۔ اس کی تفصیل اُردو ہندی رسم الخط مؤلفہ محمد الیاس برنی کے صفحہ ۱۹ سے صفحہ ۲۵ تک دیکھی جا سکتی ہے۔

اُردو زبان ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے خود بخود پیدا ہو گئی تھی چونکہ مسلمان ہندوؤں کی زبان نہیں سمجھتے تھے۔ اس لیے ایک ایسی زبان وجود میں آ گئی جو مسلمانوں اور ہندوؤں میں آہستہ آہستہ رائج ہوتی چلی گئی اور جس کی ارتقائی صورت اردو زبان کے نام سے مشہور ہو گئی۔ یہ زبان ہندوستان میں بسنے والی مختلف قوموں اور مسلمانوں کے ارتباط سے پیدا ہوئی اور اتحاد کی ایک نشانی سمجھی جانے لگی۔ جب مسلمان ہندوستان کے حکمران تھے تو دفتری زبان فارسی اور رسم الخط بھی فارسی تھا۔ جب مسلمانوں سے انگریزوں کے ہاتھوں میں حکومت آئی تو انہوں نے چھان بین کے بعد ہندوستان کی سب زبانوں میں سے اُردو کو منتخب کیا اور اس کی سرپرستی کی۔ انگریزی دورِ حکمرانی میں پنڈت مدن موہن مالویہ نے شدھی اور سنگھٹن کے دنگل قائم کیے تو ہندی کا زور بڑھ گیا اور اردو ہندی رسم الخط کا جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا۔ اخباروں اور رسالوں میں تحقیقی مضامین چھپنے لگے۔ ہندو دیوناگری خط اور مسلمان فارسی رسم الخط کے حق میں تھے۔ ہم سب سے پہلے مسٹر گاندھی کے خیالات کا تعارف پیش کرتے ہیں کہ رسم الخط کے متعلق اُن کا نظریہ کیا تھا؟

> ہندوستانی کا مطلب اُردو نہیں بلکہ ہندی اُردو کی وہ خوبصورت ملاوٹ ہے جسے اتری ہندوستان کے لوگ سمجھ سکیں اور جو ناگری یا اردو لکھاوٹ میں لکھی جاتی ہو۔ یہ پوری راشٹر بھاشا ہے باقی جو کچھ ہے وہ اُدھورا ہے۔ پوری راشٹر بھاشا سیکھنے والوں کو اب دونوں ہی لکھاوٹیں سیکھنی چاہئیں راشٹر پریم کا ٹھیک یہی تقاضا ہے جو اسے جانے گا وہ پائے گا اور جو نہ جانے گا وہ کھوئے گا۔
>
> (موہن داس کرم چند گاندھی)

ل اردو ہندی رسم خط ص ۲۴ مؤلفہ محمد الیاس برنی طبع حیدر آباد دکن)

www.taemeernews.com

"ہر ایک پڑھے لکھے ہندوستانی کو اپنی بھاشا ہندو کو سنسکرت، مسلمان کو عربی، پارسی یا فارسی اور سب کو ہندی جاننی چاہیے۔ کچھ ہندوؤں کو عربی اور کچھ مسلمانوں کو اور پارسیوں کو سنسکرت سیکھنی چاہیے۔ اتر اور پچھم میں رہنے والے ہندوستانی کو تامل سیکھنی چاہیے۔ مگر سارے ہندوستان کے لیے تو ہندی ہی ہونی چاہیے۔ اسے اردو میں لکھا جائے یا ناگری میں۔ ہندو مسلمانوں کے وچاروں کو ٹھیک رکھنے کے لیے بہت سے ہندوستانیوں کے لیے دونوں لکھاوٹوں کا جاننا ضروری ہے۔ ایسا ہونے پر ہم آپس کے بیوہار میں انگریزی کو نکال باہر کر سکیں گے۔" (ہند سوراج سنہ ۱۹۰۹ء)

"اتری ہندوستان میں جس بھاشا کو وہاں کے لوگ بولتے ہیں۔ اُسے آپ چاہے اُردو کہیں چاہے ہندی بات ایک ہی ہے۔ اُردو لکھاوٹ میں لکھ کر اُسے اردو کے نام سے پہچانئے اور ان ہی فقروں کو ناگری میں لکھ کر اسے ہندی کہہ لیجیے۔ اب رہا سوال لکھاوٹ کا۔ فی الحال مسلمان لڑکے ضرور ہی اردو لکھاوٹ میں لکھیں گے۔ ہندو زیادہ تر دیوناگری میں لکھیں گے۔ "زیادہ تر" میں اس لیے کہتا ہوں کہ ہزاروں ہندو آج بھی اپنی ہندی اردو لکھاوٹ میں لکھتے ہیں اور کچھ تو ایسے ہیں جو دیوناگری جانتے بھی نہیں۔ آخر جب ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ شک کی تھوڑی بھی گنجائش نہ رہے گی۔ جب بے اعتباری کے سب کارن دور ہو چکیں گے۔ تب جس لکھاوٹ میں شکتی رہے گی وہ زیادہ لکھی جائے گی اور وہ راشٹر کی لکھاوٹ بنے گی۔"

ہندی کا مقابلہ کرنے والی دوسری کوئی بھاشا نہیں۔ ہندی کے بعد یہ جگہ بنگلہ کو حاصل ہے۔ پھر بھی بنگالی بھائی بنگال کے باہر تو ہندی کا ہی استعمال کرتے ہیں۔ ہندی بولنے والا جہاں جاتا ہے۔ وہاں ہندی ہی کا استعمال کرتا ہے اور اس پر کسی کو اچنبھا نہیں ہوتا۔ ہندی بولنے والے دھرم پرچارک اور اردو کے مولوی سارے ہندوستان میں تقریریں ہندی ہی میں کرتے ہیں اور ان پڑھ جنتا بھی اسے سمجھ لیتی ہے۔ ان پڑھ گجراتی بھی اُتر میں جا کر ہندی کا تھوڑا بہت استعمال کر لیتا ہے۔ یہاں تک کہ اُتر کا بھیا بمبئی کے سیٹھ کی دربان گیری کرتا ہوا بھی گجراتی بولنے سے انکار کرتا ہے اور سیٹھ بھیا کے ساتھ ٹوٹی پھوٹی ہندی بولنا شروع کر دیتا ہے کہ ٹھیٹھ دراوڑ صوبوں میں بھی ہندی کی آوازیں سنائی پڑتی ہیں۔ یہ کہنا ٹھیک نہیں کہ مدراس میں تو سب کام انگریزی سے چلتا ہے۔ میں نے وہاں بھی اپنا کام ہندی میں کیا ہے۔ سینکڑوں مدراسی مسافروں کو میں نے دوسرے لوگوں کے ساتھ ہندی میں بولتے سنا ہے۔ پھر مدراس کے مسلمان بھائی تو ٹھیک ٹھیک ہندی بولنا جانتے ہیں۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سارے ہندوستان کے مسلمان اُردو بولتے ہیں اور سب صوبوں میں اُن کی گنتی کچھ کم نہیں ہے۔ اس طرح ہندی بھاشا راشٹر بھاشا بن چکی ہے۔ اُردو کا جنم بھی ہندی ہی کی اس شکتی میں سمایا ہوا ہے۔ مسلمان بادشاہ فارسی عربی کو راشٹر بھاشا نہیں بنا سکے۔ انہوں نے ہندی گرامر کو مانا اور اردو لکھاوٹ کا استعمال کر کے فارسی لفظوں کا زیادہ استعمال کیا۔ لیکن عام جنتا کے ساتھ وہ اپنے کاروبار کو پردیسی بھاشا کے ذریعہ نہ چلا سکے۔ انگریز حاکموں سے یہ بات چھپی نہیں ہے۔ جن لوگوں کو فوجی جاتیوں کا تجربہ ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ سپاہیوں کے لیے ہندی یا اردو میں اشارے رکھنے پڑتے ہیں۔ دکنی گجراتی سندھی اور بنگالی کے لیے تو یہ آسان ہے وہ کچھ ہی مہینوں میں ہندی

www.taemeernews.com

کا اچھا گیان حاصل کر کے راشٹر کا کاروبار اس میں چلا سکتے ہیں۔ تامل بھائیوں کے لیے یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ تامل وغیرہ دراوڑ بھاشائیں ہیں اور ان کی بناوٹ اور گرامر سنسکرت سے بالکل الگ ہے۔ سنسکرت بھاشاؤں اور دراوڑ بھاشاؤں کے بیچ کچھ شبدوں کی شرکت کو چھوڑ کر دوسری کوئی زیادہ شرکت پائی نہیں جاتی، لیکن یہ مشکل آج کے پڑھے لکھے لوگوں کے لیے ہی ہے۔ ان کے دلوں میں جو پریم ہے اس پر بھروسہ کر کے خاص طور پر محنت کر کے ہندی سیکھ لیں گے۔ اگر ہندی کو اس کا رتبہ حاصل ہو جائے تو آنے والے زمانے میں ہر ایک مدراسی پاٹھ شالہ میں ہندی اپنی جگہ بنا لے۔ تیلنگو والے تو آج بھی اس کام میں کوشش کر رہے ہیں۔ کون سی بھاشا راشٹر بھاشا ہو سکتی ہے جو ترکیبیں مادری بھاشا کے لیے ٹھیک ہو سکتی ہیں۔ خاص کر گجراتی کو تعلیم کا ذریعہ بنانے کی کوشش تو زیادہ تر ہم ہی کو کرنی چاہیے۔ لیکن راشٹر بھاشا کی تحریک میں سارا دیش ہاتھ بٹائے گا۔ (تقریر بھڑوچ ۱۹۱۷ء)

"مجھے اُمید ہے کہ ہم ہندی اُردو جھگڑے میں پڑ کر اپنی طاقت کم نہیں کریں گے۔ لپی کی کچھ تکلیف ضرور ہے۔ مسلمان بھائی عربی لکھاوٹ میں لکھیں گے۔ ہندو ناگری لپی میں لکھیں گے۔ اس لیے راشٹر میں دونوں کو جگہ ملنی چاہیے۔ عملداروں کو دونوں لکھاوٹوں کا لحاظ ضرور ہونا چاہیے۔ اس میں کچھ مشکل نہیں ہے۔ آخر میں جس لکھاوٹ میں زیادہ آسانی ہو گی اس کی جیت ہو گی۔ بھارت ورش میں آپسی بیوہار کے لیے ایک بھاشا ہونی چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ہم ہندی اُردو کا جھگڑا بھول جائیں۔ ہم جانتے ہیں کہ مسلمان بھائیوں کی تو اُردو ہی راشٹر بھاشا ہے۔ اس بات سے یہ بھی آسانی کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کہ ہندی یا اُردو مغلوں کے زمانے سے راشٹر بھاشا بنتی جاتی ہے۔" (اندور میں ایک تقریر ۱۹۱۸ء)

"ایک لکھاوٹ ایک بھاشا کے پرچار کو بہت آسان کر دے گی۔ پر دونوں کام ایک حد تک ہی ساتھ چل سکتے ہیں۔ ہندی یا ہندوستانی کے پرچار کا مطلب یہ بالکل نہیں کہ وہ صوبائی بھاشاؤں کی جگہ حاصل کر لے۔ یہ تو ان کی مدد کے لیے اور انتر صوبائی کاموں کے لیے ہے۔ جب تک ہندو مسلم نفرت قائم رہے گی۔ تب تک اس کا روپ الگ الگ رہے گا۔ وہ کہیں فارسی لکھاوٹ میں لکھی جائے گی اور اس میں فارسی اور عربی شبدوں کی بہتات ہو گی۔ کہیں وہ دیوناگری لکھاوٹ میں لکھی جائے گی اور اس میں سنسکرت شبدوں کی بہتات ہو گی۔ جب دونوں دل ایک ہو جائیں گے۔ تب ایک ہی بھاشا کے یہ دونوں روپ بھی ایک ہو جائیں گے اور اس کے اُس عام رُوپ میں سنسکرت، فارسی، عربی وغیرہ وہ سب ہی شبد ہوں گے۔ جو اس کی پُوری ترقی کے لیے ضروری ہوں گے۔ لیکن الگ الگ صوبوں کی بھاشاؤں کا مطالعہ کرنے میں لوگوں کو مشکل نہ ہو۔ اس کے لیے ضروری ایک لکھاوٹ کے پرچار کا یہ مقصد ہے کہ وہ دوسری تمام لکھاوٹوں کی جگہ حاصل کر لے۔ اس مقصد کو پُورا کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ تمام سکولوں میں ہندوؤں کے لیے دیوناگری کا پڑھنا ضروری کر دیا جائے۔ جیسے کہ گجرات میں کیا جاتا ہے اور دوسرے الگ الگ بھارتی بھاشاؤں کا بہت اچھا لٹریچر دیوناگری میں چھاپنا شروع کر دیا جائے۔ کچھ حد تک یہ کوشش بھی کی گئی ہے۔ میں نے دیوناگری لکھاوٹ میں چھپی گیتانجلی دیکھی ہے۔ مگر یہ کوشش بڑے پیمانے پر کی جانی چاہیے اور ایسی کتابوں کے چھاپنے پر چار ہونا چاہیے۔ اگرچہ میں

www.taemeernews.com

جانتا ہوں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لانے کے لیے تجویزیں کرنا آج کل کے وقت کے رنگ ڈھنگ کے خلاف ہے۔ تب بھی میں اس بات کو ان کالموں میں اور بھی کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں"

نوجیون ۱۲ جولائی ۱۹۲۶ء

"مولوی عبدالحق صاحب یا تاقل صاحب جیسے ادبی مسلمان چاہتے ہیں کہ عام زبان کو صرف ہندوؤں کے ذریعہ بولی بھاشا کی شکل اختیار کرنے سے بچانا ضروری ہے تو انہیں اس میں خاص مدد دینی ہوگی۔ اگر میں ہٹا سکوں تو میں ان کے دماغوں سے اردو روپ کو خالص مسلمانوں کی زبان ماننے کا خیال ہٹا دوں۔ جس طرح کہ میں ادبی ہندوؤں کا یہ خیال دور کر دوں کہ ہندی تو صرف ہندوؤں ہی کی بھاشا ہے۔ اگر دونوں کے دلوں سے یہ خیال جدا نہیں ہوتا۔ تو اتر بھارت کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی کوئی عام زبان نہیں بن سکتی۔ پھر اُسے آپ چاہیے کسی بھی نام سے پکاریں۔ اس لیے یہاں ہمیں کم سے کم نام کے اوپر جھگڑے کی ضرورت نہیں۔ اگر پوری سچائی کے ساتھ آپ کا مطلب ایک بولی سے ہے تو آپ اُسے چاہے جو نام دے سکتے ہیں۔ اب سوال لکھاوٹ کا رہتا ہے۔ مسلمان دیوناگری لکھاوٹ میں ہی لکھیں۔ اس پر ہمیں آج دھیان نہیں کرنا ہے۔ اس سوال پر زیادہ غور کی ضرورت نہیں کہ آیا اس بات پر زور دیا جائے کہ ہندوؤں کی آبادی تک اس پھیلے ہوئے سیلاب کو عربی لکھاوٹ ضرور مان لینی چاہیے۔ اس لیے ہندی یا ہندوستانی کی میں نے یہ تعریف کی ہے کہ جس بھاشا کو عام طور پر اتر بھارت کے ہندو اور مسلمان بولتے ہیں۔ وہ بھاشا ہندی یا ہندوستانی ہے چاہے وہ دیوناگری حرفوں میں لکھی جائے۔ چاہے اور خط میں اس کی مخالفت بھی ہوتی ہے۔ تو بھی میں اپنی اس بات پر قائم ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ دیوناگری لکھاوٹ کا ایک آندولن چل رہا ہے جس کا ساتھ میں دل سے دے رہا ہوں"

ہریجن سیوک ۲۲ جون ۱۹۳۶ء

کچھ اعتراضات مسٹر گاندھی پر زبان اور رسم خط کے سلسلے میں کیے ہیں۔ ان کا اقتباس یہ ہے:

"اس خط میں لکھا ہے کہ بنگلور میں دیے ہوئے کنووکیشن کے بھاشن میں آپ نے کہا ہے کہ بھارت کے ۲۰ کروڑ آدمیوں سے تعلق پیدا کرنے کے لیے کرناٹک کے اکروڑ ۱۰ لاکھ نر ناریوں کو ان کی بھاشا ہندی سیکھنی چاہیے۔ یہ بات آپ نے انہیں کے لیے نہیں کی جو ماتری بھاشا اچھی طرح جانتے ہیں تو بھی نہ ہو تو یہ ممکن ہے اور ممکن بھی ہو تو اچھا نہیں رہے۔ اور نہ قدرتی ہی ہے کہ عام جنتا ماتری بھاشا کے سوا دوسری ایک اور بھاشا سیکھے۔ راشٹری کام کرنے والے بیوپاری اور دوسرے لوگ جو اتر بھارت واسیوں کے نزدیک میں آتے ہیں۔ وہ ہی ہندی سیکھ سکتے ہیں اور انہیں کو سیکھنی چاہیے۔ وہ تو بنا کسی پرچار کے بھی ضرورت کی وجہ سے ہی یہ بھاشا سیکھ لیں گے۔ آپ کہتے ہیں کہ ہندی صوبائی بھاشاؤں کی جگہ پر نہیں بلکہ اُن کے ساتھ ساتھ سیکھی جائے۔ پر ایسا ہو نہیں سکتا۔ تامل ناڈ کے زیادہ تر پڑھے لکھے لوگ تامل کی بجائے انگریزی میں سوچتے ہیں اور محسوس بھی کرتے ہیں۔ وہ تامل کی پوری مخالفت کرتے ہیں۔ وہ انگریز تہذیب کے کس حد تک غلام ہو چکے ہیں۔ یہ ہم اسی سے سمجھ سکتے ہیں کہ عام جلسوں اور دوسری جگہوں میں بھی وہ اکثر کے ساتھ اونچی آواز سے کہتے ہیں کہ وہ تامل میں نہ تو بول سکتے ہیں اور نہ لکھ سکتے ہیں۔ پر انگریزی میں وہ یہ دونوں کام دھڑلے سے کر سکتے ہیں۔ ان میں

www.taemeernews.com

سے کچھ لوگ ہندی کا مطالعہ بھی تامل کی بجائے انگریزی کی مدد سے کرنے لگے ہیں۔ ۔ ۔ ۔

آزادی کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ الگ الگ بھاشا کے بولنے والوں پر ایک بھاشا لاد دی جائے۔ پہلی جگہ ماتری بھاشا کو ہی ملنی چاہیے۔ بھارت کی راشٹر بھاشا ہندی کو دوسری جگہ ہی دینی چاہیے۔ سچی ایکتا ہوٹ اور ترقی تو ماتری بھاشا سے ہی مل سکتی اور ہو سکتی ہے۔ اب میں لکھاوٹ کا سوال لیتا ہوں۔ مئی ۱۹۳۵ء کے ہریجن میں اندور کے ہندی ساہتیہ سمیلن کے ریزولیوشنوں پر لکھتے ہوئے آپ نے اردو لکھاوٹ کی طرف داری کی ہے۔ پر میری سمجھ میں نہیں آیا بنگلور کے بھاشن میں بھی آپ نے اردو لکھاوٹ کی طرف اپنا رجحان ظاہر کیا ہے۔ آپ تو سنسکرت سے نکلی ہوئی یا اس سے کافی اثر لیے ہوئے تمام ناگری بھارتی بھاشاؤں کی لکھاوٹوں کو برباد کر کے ان کی جگہ دیوناگری کو تخت پر بٹھا دینا چاہتے ہیں تاکہ جو لوگ وہ بھاشائیں سیکھنا چاہیں اور اسی لکھاوٹ کے ذریعے سیکھیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں جس بھاشا کو بولتے ہیں اس کے لیے دیوناگری اور اردو لکھاوٹیں قائم رکھنا چاہتے ہیں اور دوسرے کروڑوں لوگ جو بدقسمتی سے جدا جدا بھاشائیں بولتے ہیں۔ وہ اپنی لکھاوٹیں برباد ہو جانے دیں اور ان کی جگہ دیوناگری کو دے دیں اور ہندوستانی بھاشا اور لکھاوٹ سیکھ کر کروڑوں ہندوؤں اور کروڑ مسلمانوں کو سمجھنے اور ان کے نزدیک آنے کی کوشش کریں۔ کیا یہ ظلم ہی ظلم نہیں ہے۔ اس نیتی سے صاف نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ اور ساری بھاشائیں مٹ جائیں اور صرف ایک ہندی رہ جائے اور وہ بھی دونوں لکھاوٹوں میں کیونکہ سب بھاشاؤں کی لکھاوٹ تو دیوناگری ہو ہی جائے گی۔ ہندی سب سیکھ لیں گے اور ماتری بھاشاؤں کے اہم گرنتھوں کا ہندی ترجمہ ہو جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ذرا وچار کر دیکھئے کہ کیا یہ حالت ہم سب کی جنم بھومی بھارت ورش کے لیے عزت کی ہو گی۔ سب لکھاوٹوں کو برباد کرنے کی کوشش سے پہلے دیوناگری اور اردو میں سے جو ایک بھاشا کی دو لکھاوٹیں ہیں۔ ایک کو اٹھانے کی کوشش آپ کیوں نہیں کرتے۔ ایک ہی بھاشا بولنے والے ہندو اور مسلمان اپنے لیے دو الگ الگ لکھاوٹیں کیوں رکھیں؟"

ہریجن۔ ۱۵۔ اگست ۱۹۳۵ء

ایک اور خط کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ یہ خط بھی گاندھی جی کو کسی صاحب نے بھیجا تھا۔

"مہاتما جی! آپ کہتے ہیں۔ آپ کو اردو سے کوئی حسد نہیں۔ مگر آپ تو اسے کھلم کھلا فارسی لکھاوٹ میں لکھی جانے والی مسلمانوں کی بھاشا کہہ چکے ہیں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر مسلمان چاہیں تو پہلے ہی اس کی حفاظت کریں۔ دوسری طرف آپ کئی بار ہندی ساہتیہ سمیلن کی سبھاپتی رہ چکے ہیں اور ہندی کی حمایت کرتے ہوئے اس کے لیے لاکھوں کا چندہ جمع کر چکے ہیں۔ کیا کبھی آپ نے اردو کا پرچار کرنے والی کسی سبھا کی صدارت کی ہے؟ اور اب بھی آپ اس طرح کی صدارت منظور کریں گے اور کیا کبھی اردو کی ترقی کے لیے آپ نے ایک پائی بھی چندہ اکٹھا کیا ہے؟ میں تو کانگریس والوں کے منہ سے یہ سنتے سنتے دق آ گیا ہوں کہ مسلم لیگیوں کو سنسکرت شبدوں کا استعمال کرنے سے بچنا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس طرح کی جو زبان بنے گی وہ ہندوستانی ہو گی۔ مہاتما جی آپ خود ایک اچھے لیکھک ہیں۔ آپ کو تو پتا ہونا چاہیے کہ منجھے ہوئے لیکھک جن کی اپنی ایک طرز بن چکی ہے۔ کبھی فارسی اور سنسکرت

www.taemeernews.com

کے ان شبدوں کو چھوڑ نہ سکیں گے، جو ان کی اپنی بھاشا کے حصے بن چکے ہیں۔ اس لیے آپ کی یہ صلاح کام آنے والی نہیں...
آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ اگر ہندی اور اردو دونوں لازمی بنادی گئیں تو اردو ہندی کو میدان سے اکھیڑ دے گی کیونکہ ہندی کے مقابلے میں اردو زیادہ صحیح زیادہ منجھی ہوئی، زیادہ بامعنی اور زیادہ خوبصورت ہے۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ ہندی ملک کی اپنی قدرتی بھاشا ہے تو آپ کو یہ خواہش ہونا چاہیے کہ وہ اردو کو میدان سے ہٹا دے گی۔ جیسا کہ آپ نے پچھلے سال کہا تھا۔ آپ کا یہ کہنا کہ دونوں زبانوں کو لازمی بنانے کی کوئی طاقت آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے بے مطلب سا ہے۔"

(ہریجن سیوک ۸ فروری ۱۹۴۲ء)

"سنہ ۱۹۲۵ء میں کانگریس نے کانپور میں راشٹر بھاشا کو ہندوستانی نام دیا۔ دونوں لپیوں کی اجازت دی گئی۔ اس لیے ہندی اور اردو کو راشٹر بھاشا مانا گیا۔ میں نے اُسے ایک ایسی شکل دی جو تعریف کے قابل ہی تھی۔ اس لیے اگر راشٹر بھاشا کی پوری ترقی چاہیں تو ہمیں ہندی اور اردو کو اور دیوناگری اور فارسی لپی کو ایک جیسی جگہ دینی ہوگی۔ آخر میں تو جسے لوگ زیادہ بچائیں گے۔ وہی زیادہ پھیلے گی۔"

(ہریجن سیوک ۲۶ اپریل ۱۹۴۲ء)

پرشوتم لال ٹنڈن نے مسٹر گاندھی کو لکھا۔

"تقریباً ۲۰ سال ہوگئے۔ اس بیچ آپ نے ہندی پرچار کا کام ملکی نظر سے کیا۔ وہ سب کام غلط تھا۔ یہ تو آپ نہیں مانتے ہوں گے۔ راشٹری خیال سے ہندی کا پرچار تعریف کے قابل ہے۔ یہ تو آپ کا اصول ہے ہی۔ آپ کے نئے نقطۂ نگاہ کے مطابق اردو سکھانے کا بھی پرچار ہونا چاہیے۔ یہ پہلے کام سے مختلف ایک نیا کام ہے جس کا پہلے کام سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ سمیلن ہندی کو راشٹر بھاشا مانتا ہے۔ اردو کو وہ ہندی کی ایک شیلی مانتا ہے جس کا لائق آدمیوں میں رواج ہے۔ وہ خود ہندی کی تمام شیلی کا کام کرتا ہے گو کہ اردو شیلی کا نہیں۔ آپ ہندی کے ساتھ اردو کو بھی چلاتے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ آپ دونوں کو چلانا چاہتے ہیں سمیلن شروع سے صرف ہندی چلاتا آتا ہے۔ ہندی ساہتیہ سمیلن کی طرف سے چنے ہوئے پرتی ندھی ہندستانی اکیڈیمی کے ممبر ہیں اور ہندستانی اکیڈیمی ہندی اور اردو دونوں سمیلان اور پیاں چلاتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے میری عرض ہے کہ مجھے اس بات کا کوئی موقع نہیں معلوم ہوتا کہ آپ سمیلن چھوڑیں۔

بھاشا کا پکا سمجھوتہ تب ہی ہوگا جب ہم دیش کے لیے ایک عام لپی کو ترقی دے سکیں۔ کام بہت بڑا ضرور ہے۔ لیکن راشٹر کی بھلائی کی نظر سے بالکل صاف ہے۔ میرے سامنے یہ سوال سنہ ۱۹۲۰ء سے رہا ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ اس کے اٹھانے کے لیے جو سیاسی فضا ہونی چاہیے وہ نہیں ہے۔ میں اس میں نہیں پڑا اور صرف راشٹر بھاشا کے ہندی روپ کی طرف میں نے دھیان دیا۔ یہ سمجھ کر کہ اس کے ذریعہ صوبائی بھاشاؤں کو ہم ایک راشٹر بھاشا کی طرف لگا سکیں گے۔"

پرشوتم لال ٹنڈن ۸ جون ۱۹۴۵ء

"مجھے اس بات پر ملامت کی جاتی ہے کہ میں ایسے مقاصد کی جدوجہد کرتا ہوں۔ جن کو کوئی تائید حاصل نہیں ہوتی اور اس طرح اپنی زندگی ضائع کرتا ہوں۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں ہندوستانی زبان کو ہندی اور اردو رسم الخط کے ساتھ مقبول بنانے

www.taemeernews.com

کی کوشش کرکے گویا ستے کی رٹی رٹ رہا ہوں خصوصاً جبکہ پاکستان ایک مسلّم حقیقت بن چکا ہے۔ میں شدت کے ساتھ اس رائے سے اختلاف کرتا ہوں۔ یہی وقت میرے لیے وہ ہے جب کہ مجھے محنت کرکے دونوں رسم الخط سیکھنے چاہئیں اور ایسی زبان بولنا چاہیے جو دونوں زبانوں کا ایک مناسب مرکب ہو۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ شمالی ہند میں بڑی تعداد ایسے ہندوؤں کی ہے جو صرف ایسی اُردو جانتے ہیں جو اُردو رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ کیا یہ سب ہندو اردو زبان اور رسم الخط کو بھول کر ہندی اور ناگری رسم الخط اختیار کریں گے؟"

(پراتھنا ۱۳ جولائی ۱۹۵۰ء)

"شری گگن بھائی ڈیسائی نے اس خط و کتابت کی نقل مجھے بھیجی ہے جو شری رتن لال پر لکھ کے ساتھ ہوئی شری رتن لال کے خط میں لکھا ہے کہ اخباروں میں کانگریس پارٹی کا ہندی بھاشا کے بارے میں جو فیصلہ چھپا ہے۔ اس کا لوگوں پر بہت اثر پڑا ہے۔ اردو لپی سے انہیں اتنی چڑھ ہو گئی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ زندہ چیز نہیں۔ کٹر کانگریسی بھی اب تو اردو کی مخالفت کرنے لگے ہیں۔ اس لیے اگلی فروری میں ہونے والے ہندستانی امتحانوں میں ودیارتھیوں کی تعداد شاید گھٹ جائے گی۔"

(ہریجن سیوک ۱۰ اگست ۱۹۴۰ء)

مسٹر گاندھی اور ان کے رفقا اور دوسرے زعما نے ہندی اور دو رسم الخط کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔ مسٹر گاندھی سے لے کر مسٹر ٹنڈن اور دوسرے کانگریسی رہنماؤں نے اپنے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کر دی ہے۔ دیوناگری اور فارسی رسم خط دونوں زبانوں ہندی اور اُردو کے لیے اختیار کرنے کا عندیہ بھی دبی زبان میں ملتا ہے اور واضح الفاظ میں دیوناگری رسم خط کے لیے پوری پوری سفارشیں بھی مذکورہ خط کشیدہ سطروں سے ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ اب ہم مسلمان قائدین کے خیالات اس ضمن میں پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحق بابائے اُردو نے پنڈت شرما کا قول پہلے نقل کیا ہے اور پھر اس پر اپنے خیالات کا اس طرح اظہار کیا ہے۔
"اُردو رسم الخط کے متعلق شرما صاحب فرماتے ہیں جلی اشتاکھشی میں اردو لپی (رسم خط) خود ہی مرے گی۔ اس کو ختم کرنے کی کوشش کرنا مُرے کو مارنے شاہ مدار کا حکم رکھتا ہے۔" یہ کلمہ بڑے غرور کا ہے اور ایسے بڑے بول صرف اکثریت کا غرور بول سکتا ہے زبان اور تہذیب کے مسائل تعداد کی کمی بیشی اوسط اور فی صدی کے حساب سے طے نہیں ہوا کرتے۔ اس کے لیے کسی قدر رواداری ہمدردی اور انصاف کی بھی ضرورت ہے۔ اُردو رسم خط ہندی کی طرح ہندوستان کے ایک آدھ علاقے تک محدود نہیں بلکہ یہ ہندوستان کے باہر بھی بہت سے ملکوں میں رائج ہے۔ کہاں کہاں مٹائیں گے۔ یہاں یہ اُردو کی پیدائش کے ساتھ آیا ہے۔ ہندوستان میں ایک دو رسم خط نہیں بیسیوں ہیں۔ سب سے پہلے بنگالی، تامل، تلگو، کنڑی، ملیالم وغیرہ زبانوں کو یہ مشورہ دینا چاہیے جن کی نسبت یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ سنسکرت سے بہت قریب بلکہ سنسکرت کے بچے ہیں، اس کے بعد اُردو کی باری آئے گی۔"

(ہماری زبان ۱۶ جولائی ۱۹۴۱ء)

www.taemeernews.com

"وزیر اعظم (سی پی) نے صاف صاف کہہ دیا کہ اس صوبے کی زبان ہندی ہوگی۔ مدارس اور کالجوں میں ذریعہ تعلیم ہندی ہوگا۔ دفتروں اور عدالتوں میں بھی ہندی رہے گی۔ خانگی مدارس جو اس کی تعمیل نہیں کریں گے۔ ان کو امداد نہیں دی جائے گی۔۔۔ اس کے بعد یو پی نے بھی یہی راگ الاپا۔ اس کا اثر میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں پر بھی پڑا اور انتہا یہ ہے کہ کانگریس پارٹی نے ایسے جلسے میں کثرت رائے سے قرارداد منظور کر دی کہ اس ملک کی زبان ہندی بہ خطِ ناگری ہوگی۔ آل انڈیا ریڈیو نے تو اس پر مہرِ ثبت کر دی جس کے یہ معنی ہیں کہ اُردو دلّی اور لکھنؤ کی بھی زبان نہیں۔" (خطبات عبدالحق صہ ۱۵۵، ۵۵۰)

"اردو کو کچلنے اور دبانے کے لیے بعض اوقات بڑی گہری تدبیریں کی گئیں جو بظاہر بڑی معصوم معلوم ہوتی ہیں، لیکن ان کی تہہ میں ایک ہی چیز تھی یعنی اردو کی جڑ کھوکھلی کرنا۔ بہت دنوں کی بات ہے کہ ایک انجمن بنائی گئی جس میں ہندوستان کے چوٹی کے لیڈر اور نامور لوگ شامل اور شریک۔ اس کا نام "ون لینگوایج اینڈ ون اسکرپٹ (ONE LANGUAGE AND ONE SCRIPT) یعنی ایک زبان اور ایک رسم خط۔ وہ ایک زبان اور ایک رسم خط کیا تھا۔ جسے تمام ہندوستان میں رائج کرنا چاہتے تھے۔ وہ زبان ہندی تھی اور رسم خط ناگری" (خطبہ صدارت اردو کانفرنس بنگلور ۲۴ جون ۱۹۴۲ء)

"ہمارا رسم الخط" جناب مولوی عبدالقدوس صاحب ہاشمی کی ایک نادر تالیف ہے جسے انجمن ترقی اُردو (ہند) دلی نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کی ضخامت ۴۰ صفحات ہے۔ اس میں انہوں نے ناگری رسم الخط پر بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

"میں برسوں سے اردو اور ناگری رسم الخط پر غور کر رہا ہوں۔ میں نے بہت سے مضامین بھی ہندی میں لکھے ہیں۔ ناگری خط سے مجھے عناد نہیں لیکن پھر بھی میں یقین کرتا ہوں کہ ناگری خط ایک نامکمل اور تکلیف دہ رسم الخط ہے۔ میری رائے میں زبان اور خط کے مسئلے پر جس نقطۂ نظر سے مسٹر گاندھی اور آنریبل سی۔ راج گوپال اچاریہ غور کرتے ہیں وہ صحیح نہیں ہے۔ زبان ہندوؤں اور مسلمانوں کی نہیں ہوا کرتی بلکہ کسی ملک یا دیس کی ہوتی ہے۔ آپ نے کبھی نہیں سنا ہوگا کہ عراق کے مسلمان عربی اور عیسائی عبرانی یا کلدانی زبان بولتے ہیں اور نہ آپ کے تصور میں یہ بات آسکتی ہے کہ بنارس کے مسلمان عربی اور ہندو سنسکرت بولتے ہوں گے کیونکہ ایسا ہونا عقل کے خلاف ہے اور فطرت انسانی کے اقتضا کے بالکل منافی۔ ہر ملک کی زبان وہ ہوتی ہے جس میں اس ملک کے رہنے والے چاہے وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں بات چیت کیا کرتے ہیں اور وہی زبان ان کے لکھنے پڑھنے اور تمام ضروریات میں استعمال کی جاتی ہے۔ پھر یہ کیسا صاف جھوٹ اور کتنی غیر حقیقی بات ہے کہ اُردو مسلمانوں کی اور بھاشا کو ہندوؤں کی زبان قرار دیا جائے۔ کیا کہیں آج ہندستان کے کسی حصے میں تُلسی داس کی رامائن والی یا خان خاناں کے دوہروں والی زبان بولی جاتی ہے۔ ہندی کے رسالوں میں جو زبان استعمال کی جاتی ہے۔ وہ ہندوستان کے کسی حصے بلکہ کسی گھرانے میں کہیں بولی نہیں جاتی۔ صدیاں گزریں کہ وہ زبان ہندستان سے رُخصت ہوگئی۔ بالکل اسی طرح جیسے سرکاری دفاتر سے فارسی ختم ہوگئی ان علاقوں میں جہاں اردو یا ہندستانی زبان بولی جاتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی، بدھ اور لامذہب سب ہی بستے ہیں۔ لیکن سب کی الگ الگ زبانیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی زبان ہے جس سے اپنے دل کی دوسرے کو سُناتے اور دوسرے کی کہی خود سُنتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو شاید آقا اور نوکر، باپ بیٹے اور دو پڑوسیوں میں کبھی تبادلۂ خیالات

www.taemeernews.com

ممکن نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ ان حالات میں کوئی زبان یا رسم خط کسی مذہب کے ساتھ مخصوص نہیں ہو سکتا بلکہ ہر زبان اور ہر رسم الخط دیس یا ملک سے مخصوص ہوتا ہے۔ ہمارے کسی لیڈر کا یہ کہنا کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے اور قرآن مجید کے رسم خط میں لکھی جاتی ہے تعصب اور تنگ نظری نہیں تو مہمل اور ناسمجھی کی بات ضرور ہے۔ یہ بھی غلط ہے کہ کوئی زبان کسی دوسری زبان سے رسم الخط لے کر کام چلالے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ دوسری زبان کے رسم الخط میں بہت سی اصلاحات اور اضافے کرکے اپنا بنانا پڑے گا۔ تیسری صدی ہجری میں جب فارسی نے عربی کا رسم الخط اپنی زبان کے لیے لیا تو اس میں کئی حروف کے اضافے کیے گئے۔ فارسی کے لیے جو رسم الخط رائج تھا وہ پیدا ہونے والی زبان کا ساتھ نہ دے سکا۔ اس لیے مجبوراً اس کو چھوڑ کر دوسری زبان کے رسم الخط میں اپنی ضرورت کے مطابق اضافے کرکے اپنا بنانا پڑا۔ اسی طرح ترکی نے اپنا رسم الخط بدلا تو لاطینی رسم الخط میں ۹،۱۰ حروف نقطوں اور نشانوں سے بنانے پڑے۔ آج جو رسم الخط دنیا کے مختلف ممالک میں رائج ہیں وہ سب کے سب اپنی اصل کے اعتبار سے کسی نہ کسی مُردہ زبان کے رسم الخط کی اصلاح یافتہ شکلیں ہیں۔

ہندوستان میں بھی یہی ہوا سنسکرت آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان کی بولی کبھی نہ تھی۔ مُقدّس اشلوکوں کی خاص علمی زبان تھی۔ عوام سے اس کا کبھی تعلق نہیں تھا۔ شمالی ہندوستان میں عوام اس وقت ایک ملی جُلی سی زبان بولا کرتے تھے جس کے پاس کوئی رسم الخط نہ تھا۔ مقدّس نوشتوں کے لیے جو سنسکرت میں تھے۔ ایک رسم الخط رائج تھا، جس کی اصلاح شدہ شکل موجود ناگری اور سادہ شکل بہار کا کیتھی رسم الخط ہے جب پالی نے رواج پایا۔ پالی رسم الخط بھی ساتھ آیا۔ جب پالی رخصت ہوئی۔ برج بھاشا نے اپنا بستر بچھایا۔ پالی رسم الخط سے کام نہ چل سکا۔ رسم الخط بھی ساتھ ساتھ رخصت ہو گیا۔ قدیم رسم الخط کی شکلیں درست کی گئیں۔ اصلاح و ترمیم ہوئی۔ دیوناگری نام سے رسم الخط بنا۔ یہ بولی جب تک بولی جاتی تھی۔ رسم الخط اس کے لیے کام آتا رہا۔ شیخ محمد جائسی اور عبدالجلیل بلگرامی کے دور تک چلے آئیے آپ دیکھیں گے کہ فارسی رسم الخط متعارف اور دفتری رسم الخط ہونے کے باوجود بھاشا کا سرمایۂ ادب سب کا سب ناگری میں لکھا جاتا رہا۔

اردو یا کھڑی بولی جب دکن سے نکلی کر شمالی ہندوستان میں پھیلی تو اس کے لکھنے کے لیے رسم الخط کا مسئلہ سامنے آیا اور ٹھیک وہی سوال پیدا ہوا جو برج بھاشا کے ابتدائی دور میں پیدا ہوا تھا۔ پالی رسم الخط جیسے برج بھاشا کے لیے کارآمد نہ ہو سکا۔ اردو کے لیے بھی بھاشا کے رسم الخط سے کام چلتا نظر نہ آیا۔ گردوپیش نظر کی گئی تو سب سے زیادہ آسان اور متعارف رسم الخط فارسی کا نظر آیا۔ ٹ۔ ڈ۔ ڑ وغیرہ بڑھا کر اپنا بنایا اور کام لیا جیسے بھاشا کے شاعروں تلسی داس اور سور داس نے اپنے دواوین کو فارسی رسم الخط میں لکھنے کی کوشش نہ کی اسی طرح لعل چند رنگین اور رنگ آبادی اور دیا شنکر نسیم لکھنوی نے اپنے کلام کا مجموعہ ناگری میں نہ لکھا۔ اُردو رسم الخط اگرچہ فارسی رسم الخط سے لے کر بنایا گیا ہے۔ لیکن اسے بعینہٖ فارسی کا رسم الخط نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ اگر نسبت اصل کی طرف ہی منظور ہے۔ تو ہندی رسم الخط کو بھی سنسکرت بلکہ قدیم سامری رسم الخط کہا کیجیے۔ کیونکہ تاریخ کا وسیع علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ ناگری میں اپنا اس سے زیادہ حصّہ نہیں جتنا اردو رسم الخط میں اُردو کا حصّہ ہے۔

www.taemeernews.com

ہاں اگر مردہ زبان سنسکرت یا مُردہ بھاشا کو ہندوستان میں زندہ کرکے تاریخ کا سب سے پہلا تجربہ کرنا ہے اور آہستہ آہستہ ہندستان کی روزمرّہ کی زبان کو سنسکرت زبان بنانا چاہتے ہیں جو کبھی کسی زمانے میں روزمرّہ کی زبان نہ تھی تو یہ ایک الگ مسئلہ ہے جس پر کسی اور فرصت میں کچھ عرض کیا جاسکے گا۔ لیکن اگر اسی زبان کو زندہ رکھنا ہے جسے ہم آپ سب بولتے ہیں اور جسے گاندھی جی ہندی ہندستانی کے مصل مرکب سے یاد فرماتے ہیں تو آپ یقین فرمائیں کہ اس کے لیے ناگری یا لاطینی رسم الخط کام نہیں ہوسکتا۔"
(اقتباس از ہمارا رسم الخط)

"اُردو زبان اور اس کا رسم خط" کے عنوان سے پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب لکھنوی کی ایک مختصر مگر جامع تالیف ہے۔ پہلا حصہ اردو زبان کی ابتدا کے متعلق ہے اور دوسرے حصے میں انھوں نے "اُردو کا رسم خط" کے مسئلہ پر بحث کی ہے صفحات ۹۲ اور کتاب نگر، دین دیال روڈ لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے۔ اس بحث پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"ہماری زبان کے موجودہ مسائل میں رسم خط کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے بعض لوگ ناگری تحریر کو فارسی رسم خط پر ترجیح دیتے ہیں اور اردو کی موجودہ تحریر میں نقص نکالتے ہیں کہ اس میں ایک ہی لفظ کئی طرح پڑھا جاسکتا ہے بظاہر یہ اعتراض بہت وزنی معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا وزن بہت گھٹ جاتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حقیقت میں یہ دقت بہت کم پیش آتی ہے ۔ ممکن ہے کہ اگر تنہا ایک لفظ یا ایک فقرہ کہیں لکھا ہو تو اس کے پڑھنے میں کبھی غلطی ہو جائے مگر عموماً لفظ کسی جملے میں اور فقرہ کسی عبارت میں ہوتا ہے اور اس لفظ کے گرد و پیش کے لفظ اور اس فقرے کے آس پاس کے فقرے اس کے پڑھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ایک بات اور بھی ہے۔ جو ایک مثال سے سمجھ میں آجائے گی۔ فرض کیجیے کہ کہیں لفظ خط لکھا ہوا ہے۔ اُسے تین طرح پڑھ سکتے ہیں، خَط، خِط، خُط۔ مگر خِط اور خُط سے ہمارے کان آشنا نہیں اور خَط پہلے سے ہمارے ذہن میں موجود ہے ۔ اس لیے جہاں کہیں ہم خط لکھا ہوا دیکھیں گے۔ اُسے بلا تأمل خَط ہی پڑھیں گے۔ اگر کبھی ہمارا ذہن بھٹک کر خِط یا خُط کی طرف چلا جاتا ہے تو یہ خیال کہ ہماری زبان میں خِط یا خُط کوئی لفظ نہیں ہے۔ اُسے سیدھے راستے پر لگا دیتا ہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ اس موقعے پر وہ لوگ نظر انداز کر دیے گئے ہیں جو اُردو زبان سے واقف نہیں۔ مگر صرف حروف سیکھ کر کسی زبان کی تحریروں کا بالکل صحیح پڑھ لینا ممکن نہیں۔ اس میں اُردو کی کیا تخصیص ہے۔ پھر یہ اتفاق تو شاذ و نادر ہی ہوگا کہ جو شخص اردو نہ جانتا ہو وہ اردو کی تحریریں پڑھنا چاہے۔ ایسے نادر اتفاقات کے خیال سے اُردو رسم خط میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ اس کے علاوہ اگر لفظوں پر اعراب لگے ہوئے ہوں۔ تو ایک حرف شناس آدمی بغیر مطلب سمجھے ہوئے بھی اُردو کی عبارت پڑھ سکتا ہے۔ آخر اعراب بھی تو ہمارے رسم خط کا ضروری جزو ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ابتدائی درسی کتابوں کے علاوہ اعراب کا استعمال بہت کم کرتے ہیں، اور یہ مہارت پیدا کرلیتے ہیں کہ بغیر اعراب کے کسی تحریر کو روانی کے ساتھ پڑھ لیں۔

یہ مہارت پیدا کرنے میں اُردو رسم خط کی ایک خاص خصوصیت سے بہت مدد ملتی ہے وہ خصوصیت یہ ہے

www.taemeernews.com

کہ اردو تحریر میں لفظ کا اصل ڈھانچا صرف حروفِ صوت (CONSONANTS) سے بنتا ہے۔ اعراب (VOVELS) اس ڈھانچے کے اندر بیٹھے ہوئے ہیں بلکہ حرفوں کے اُوپر یا نیچے الگ سے لگا دیئے جاتے ہیں۔ کسی لفظ کو پڑھتے وقت نگاہ اور توجہ کا مرکز اس کا اصل ڈھانچا ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا نقش جو دماغ میں بنتا ہے۔ اس میں اس کا ڈھانچا بہت اجاگر ہوتا ہے اور اعراب دھندلے اور چونکہ اعراب ترک کر دینے سے لفظوں کے ڈھانچے میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے اُردو عبارت بغیر اعراب کے آسانی سے پڑھ لی جاتی ہے۔ یہ بات اُن تحریروں میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ جن میں اعراب لفظوں کے ڈھانچے میں سمائے ہوئے ہوتے ہیں جیسا کہ ناگری اور رومن تحریروں میں ہوتا ہے۔

اب رہی گھسیٹ لکھائی تو اس کا پڑھنا ناگری تحریر میں اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے جتنا اُردو تحریر میں۔ جو شخص اردو لکھنا پڑھنا جانتا ہے۔ وہ تھوڑی سی مشق کے بعد گھسیٹ میں لکھی ہوئی اُردو عبارت آسانی سے پڑھ سکتا ہے۔ اُردو تحریر کوئی سوا سو برس سے کچہریوں اور دفتروں میں استعمال کی جا رہی ہے اور اس سے پہلے بھی کچہریوں اور دفتروں کی زبان فارسی تھی۔ تب بھی یہی حروف سیکڑوں برس استعمال میں رہ چکے تھے۔ پولیس اور کچہری والوں کی گھسیٹ لکھائی لفظوں کی صورت ہی بگاڑ دیتی ہے۔ پھر بھی ان حرفوں کی وجہ سے کوئی خاص دقت کبھی پیش نہیں آئی۔ کبھی سننے میں نہیں آیا کہ اس رسمِ خط کی خرابی سے ایک فریق کی جگہ دوسرے پر ڈگری ہو گئی یا مجرم کی جگہ کوئی بے قصور سزا پا گیا ہو۔ صدیوں کے ان عملی تجربوں کے مقابلے میں خیالی اعتراض اور فرضی دشواریاں کیا اہمیت رکھتی ہیں فارسی حروف ایک زمانے میں اس قدر مقبول ہو گئے تھے کہ ہندی زبان کی کتابیں بھی انہیں حروف میں لکھی جاتی تھیں ملک محمد جائسی کی پدماوت کو ہندی ادب میں جو بلند درجہ حاصل ہے۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس کتاب کے جتنے قدیم نسخے دستیاب ہوئے ہیں۔ وہ سب فارسی حرفوں میں لکھے ہوئے ہیں اور یہ کوئی تنہا مثال نہیں ہے۔ ایسی بہت سی کتابیں میری نظر سے گزر چکی ہیں اور خود میرے مختصر کتابی ذخیرہ میں ہندی کی کئی کتابیں فارسی حرفوں میں لکھی ہوئی موجود ہیں جن کے نام یہ ہیں۔

(۱) سُندر سنگار — مُصنّفہ سندر کوی

(۲) رسا رتَو — مُصنّفہ دیو کوی۔ نائکا بھید گنگا دھر نے ۱۲۱۳ھ میں نقل کی۔

(۳) بھاکھا بھوکن۔ النکار ۱۲۱۳ھ میں نقل کی گئی۔

(۴) امر چندر کا — بلاغت مصنفہ امر سیس

(۵) رسک پریا — مُصنّفہ کیشو داس۔

(۶) رس راج — مُصنّفہ متی رام، متا لال، شیو پرشاد، امید علی اور طالب حق نے ۱۲۱۸ھ میں نقل کی۔

(۷) رام چندر کا — مصنفہ کیشو داس سمبت ۱۸۶۰ میں نقل کی گئی۔

(۸) انیکارتھ — مُصنّفہ نند داس

(۹) نام مالا — ۱۲۱۵ھ میں نقل کی گئی۔

(۱۰) انور چندر کا — مصنفہ انور کوی

www.taemeernews.com

(۱۱) لیلاوتی ٹیکا   مصنفہ دویادھر

(۱۲) بھگود گیتا   مصنفہ ہری بلبھ سمبت ۱۸۷۴   میں نقل کی گئی۔

(۱۳، ۱۴) دو رسالے ناٹکا بھید پر

(۱۵) ایک منظوم کتاب   مصنفہ بہاری لال

(۱۶) ایک مجموعہ جس میں رحیم، احمد، تلسی داس وغیرہ کے دوہے شامل ہیں۔

یہ بات اکثر سننے میں آتی ہے کہ ناگری کے مقابلے میں اردو کی تحریر بہت مشکل ہے۔ ممکن ہے کہ ناگری کا سیکھنا نسبتہً کچھ آسان ہو مگر اتنا آسان نہیں ہے جتنا بعض لوگ خیال کرتے ہیں اُردو اور ناگری تحریروں کا مقابلہ کرنے کے لیے تفصیلی اور طولانی بحث درکار ہے۔ اس سلسلے میں اس وقت صرف چند باتیں کہنا ہیں۔

(۱) اردو حروف ناگری حروف سے بہت زیادہ آوازیں ادا کر سکتے ہیں۔

(۲) اُردو کے مفرد حروف بہت سادے اور مختصر ہیں اور جب وہ دوسرے حرفوں سے ملا کر لکھے جاتے ہیں تو اور بھی مختصر ہو جاتے ہیں۔

(۳) ناگری کے مفرد حرفوں کی شکلیں اُردو حرفوں سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہیں۔ اس لیے ان کو سیکھنے میں بھی زیادہ دقّت ہے اور لکھنے میں بھی۔

(۴) ناگری میں دس مختلف آوازوں کی خفیف اور ثقیل یعنی ہلکی اور بھاری دونوں صورتوں کے لیے الگ الگ حروف مقرر کیے گئے ہیں۔ حالانکہ ثقیل آوازیں حقیقت میں نئی آوازیں نہیں ہیں بلکہ خفیف آوازوں میں "ہ" کی آواز شامل ہونے سے بن جاتی ہیں۔ اُردو تحریر میں اس حقیقت پر نظر رکھی گئی ہے اور ثقیل آوازوں کے لیے علیحدہ علیحدہ علامتیں مقرر کر کے حرفوں کی تعداد میں بے ضرورت اضافہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ ان کو ظاہر کرنے کے لیے معمولی حرفوں کے ساتھ "ھ" لکھ دی جاتی ہے رومن رسم الخط میں بھی یہی کیا جاتا ہے۔ مثلاً ت کی ثقیل صورت تھ کے لیے T کے ساتھ H لکھ دیا جاتا ہے جیسے THEME، THIN، THURSDAY، THORAX، MATHEW۔ ناگری میں بھی جن ثقیل آوازوں کے لیے مخصوص حرف موجود نہیں ہیں وہ اسی طرح لکھی جاتی ہیں۔ معمولی حرفوں کو "ہ" کے ساتھ ملا کر لکھتے ہیں۔ مثلاً کولھو، چولھا، آلھا، کلھاڑی، کمھار، ننھا، کنھیا میں لھ اور مھ کی آوازیں یوں ظاہر کی جاتی ہیں [illegible] اسی طرح ثقیل آوازیں ظاہر کی جا سکتی تھیں۔ ان کے لیے علیحدہ علیحدہ علامتیں مقرر کرنے سے ناگری حرفوں کی تعداد بلا ضرورت بڑھ گئی۔ اس کے باوجود ڑ اور رھ کے ملنے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے جیسے سرہانا وہ ناگری تحریر میں ادا نہیں کی جا سکتی۔ یہی حال ڑ اور ڑھ کی مخلوط آواز کا ہے۔ جیسے گاڑھا، کڑھائی، چڑھنا، گڑھا۔

نہ اردو ہندی رسم الخط مولفہ محمد الیاس برنی طبع اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد دکن میں اردو اور ہندی حروف تہجی کی بحث نہایت قابلیت سے کی گئی ہے جس کے مطالعہ سے اردو اور ناگری رسم الخط کے درمیان میں فرق پر پوری روشنی پڑتی ہے اور یہ آئینہ ہو جاتا ہے کہ ناگری کے مقابلے میں اُردو رسم خط آسان ہے اور حروف تہجی بھی کم ہیں۔

www.taemeernews.com

(۵) ناگری میں زبر کی حرکت ہر حرف کی ذات میں شامل سمجھی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حرفوں کی تمام حرکتوں کے لیے علامتیں موجود ہیں جو ماترے کہلاتی ہیں مگر زبر کے لیے کوئی ماترا نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب کسی حرف میں زبر کی حرکت کو غیر موجود دکھانا ہوتا ہے تو اس کو اس کے بعد والے حرف سے ملا کر لکھتے ہیں اور اس حالت میں کبھی پہلے حرف کی کبھی دوسرے حرف کی اور کبھی دونوں حرفوں کی صورت بدل جاتی ہے۔ اس طرح دو دو حرفوں کے ملانے سے جو نئی صورتیں یا مرکب بنتے ہیں ان کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ بعض موقعوں پر تین تین حرف ملا کر لکھے جاتے ہیں تو اور بھی زیادہ پیچیدہ اور مشکل صورتیں بن جاتی ہیں میڈیکل ہال بنارس میں سنہ ۱۸۸۱ء کی چھپی ہوئی ہندی پرائمر[*] میں ناگری کے دہرے اور تہرے حرف دیے ہوئے ہیں دو دو حرفوں کے ملنے سے جو شکلیں بنتی ہیں ان کی تعداد ۳۸۲ اور تین تین حرفوں کے ملنے سے جو شکلیں بنتی ہیں ان کی تعداد ۶۷ ہے۔ اس طرح ناگری کے مرکب حرفوں کی مجموعی تعداد ۴۴۹ ہوئی۔ دو تین حرفوں کو ملا کر ایک کرنے کا کوئی اصول بھی مقرر نہیں ہے۔ اس لیے ان سب صورتوں کو یاد کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔

(۶) ناگری میں تشدید کے لیے کوئی علامت نہیں ہے۔ مشدّد حرف ادھورا لکھ کر پورے حرف سے ملا دیا جاتا ہے۔ ادھورے حرفوں کی صورتیں اور ان کو پورے حرفوں سے ملانے کے طریقے تعداد میں اتنے زیادہ ہیں کہ ان سب کو یاد رکھنے کے لیے بہت محنت اور مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ اردو تحریر میں حرف پر تشدید کی چھوٹی سی علامت بنا دینا کافی ہوتا ہے۔

(۷) ناگری میں حرف ر کی آواز کو ظاہر کرنے کے لیے متعدد علامتیں ہیں جو مختلف حالتوں میں مختلف جگہوں پر مختلف صورتوں سے لکھی جاتی ہیں۔ اسی طرح نون غنہ کے لیے کئی علامتیں ہیں۔ جو مختلف حرفوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ حرف ش کی آواز کے لیے بھی ناگری میں دو حرف ہیں بعض میں ایک حرف لکھا جاتا ہے بعض میں دوسرا۔

(۸) بعض آوازوں کے لیے دو دو حرف ہیں جن میں کسی طرح کا کوئی فرق نہیں ہے، خواہ ایک حرف لکھا جائے، خواہ دوسرا جیسے अ اور अ ، झ - झ ، ल ، ण ण

(۹) کھ کی آواز کے لیے جو حرف ہے وہ ر اور و کی علامتوں کا مجموعہ ہے۔ اس سے بڑی خرابیاں پڑ سکتی ہیں۔ مثلاً دوا کھانا ہے لکھا جائے تو اس کو دوا رواتا ہے بھی پڑھ سکتے ہیں۔ اور اب خ کی آواز کو ظاہر کرنے کے لیے کھ کے نیچے نقطہ بھی نہیں دیا جاتا۔ اس لیے اس فقرے کو 'دواخانہ ہے' بھی پڑھ سکتے ہیں۔

یہ چیزیں ناگری تحریر میں اچھی خاصی دشواری پیدا کرتی ہیں اور ان سب پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندی کے تمام لفظوں کو بھی نقطہ کس کر ناگری حرفوں میں صحیح طور پر لکھ لینا ممکن نہیں۔

ناگری کے بعض حرف جو صرف سنسکرت لفظوں میں آتے ہیں۔ ان کی صورت بہت پیچیدہ اور تلفظ نہایت مشکل ہے۔ یہ حروف ہندی الف بے سے تقریباً خارج کر دیے گئے تھے۔ مگر اب جب کہ ہندی لفظوں کا تلفظ اصل سنسکرت

---

[*] یہ پرائمر کلکتہ بک سوسائٹی کے لیے چھاپی گئی تھی۔ اس کا ایک نسخہ کرمی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ ادیب

www.taemeernews.com

کے مطابق کیا جا رہا ہے اور سنسکرت کے نئے الفاظ ہندی میں کثرت سے داخل کیے جا رہے ہیں تو وہ حروف بھی استعمال میں آئیں گے اور تحریر کی دقتوں کو بڑھائیں گے۔

ناگری رسم خط کے طرف دار اکثر ان دقتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں، لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اُردو تحریر سیکھنے میں ناگری سے کچھ زیادہ وقت صرف ہوتا ہے، تو بھی آخر میں اُردو ہی کی تحریر نفع بخش ثابت ہوگی یعنی اگر ایک آدمی تیس چالیس برس تک برابر اردو حرفوں میں لکھتا رہے اور دوسرا ناگری حرفوں میں۔ تو اردو لکھنے والے کے کام کی مقدار کہیں زیادہ نکلے گی اور اس کو ابتدا میں جو تھوڑے سے وقت کا نقصان پہنچا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ نفع ہوگا۔ اُردو کی تحریر ایک طرح کی مختصر نویسی (شارٹ ہینڈ) ہے جس کو تھوڑی سی مشق سے ہر شخص پڑھ لکھ سکتا ہے۔ اس میں یہ خوبی ہے کہ لکھنے میں وقت بھی کم لگتا ہے اور کاغذ بھی۔ اور اس عجلت پسندی اور اقتصادی کش مکش کے زمانے میں یہ وقت اور کاغذ کی بچت نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔

ناگری کے طرف دار اکثر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے سے ہر زبان کی تمام آوازیں ظاہر کی جا سکتی ہیں۔ یہ حقیقت سے بہت دور ہے۔ دوسری زبانوں کو چھوڑ کر صرف انگریزی کے لفظوں پر نظر کیجیے تو معلوم ہوگا۔ WAS 'MIRAGE' BIRD WORLD DOG' PEN) کے سے معمولی لفظوں کا تلفظ بھی ناگری حرفوں سے ادا نہیں کیا جا سکتا۔ عربی اور فارسی لفظوں کے معاملے میں بھی ناگری حرفوں کا یہی حال ہے۔ دوسری زبانوں کا کیا ذکر خود ہندی کے بہت سے لفظ ایسے ہیں جن کا تلفظ ناگری حرفوں سے نہیں ادا ہو سکتا۔ مثلاً دہ چھپاؤں۔ کھڑاؤں۔ چناؤ۔ پھیلاؤ۔ دکھاؤ۔ سناؤ۔ سرہانا۔ جواہر، نہر وان حالات میں یہ دعویٰ کہاں تک درست ہے کہ ہر زبان کے الفاظ ناگری حرفوں میں لکھے جا سکتے ہیں اور رسم خط کے لیے یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اتنا تو بے خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اُردو حرفوں میں ناگری حرفوں سے کہیں زیادہ آوازیں ظاہر کی جا سکتی ہیں۔

ناگری میں ڑا اور ڑھ کے لیے کوئی حرف نہیں۔ ڈا اور ڈھ کے نیچے ایک نقطہ لگا کر یہ آوازیں ادا کر لی جاتی ہیں۔ اسی طرح چند قریب المخرج حرفوں کے نیچے نقطہ لگا کر خ، ذ، ز، ص، ظ، غ، ف، ق کی آوازیں ادا کرنے کا نہایت آسان طریقہ رائج تھا لیکن اتر پردیش کی ریاستی حکومت اور ملک کی مرکزی حکومت نے تعلیم، کتابت، طباعت وغیرہ کے بڑے بڑے ماہروں کے مشورے سے ناگری خط میں جو اصلاحیں کی ہیں۔ ان کی رو سے اب یہ طریقہ ترک کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح متعدد آوازیں ناگری رسم خط سے خارج ہو گئیں اور اُردو کے ہزاروں اور انگریزی فرانسیسی وغیرہ کے سیکڑوں لفظ جن میں یہ آوازیں شامل ہیں۔ اگر ناگری خط میں لکھے جائیں تو ان کی ہیئت ہی بگڑ جائے گی فیض پھیج، غالب گالب اور غزل گجل ہو جائے گی۔ خزانہ کھجانا، خربوزہ کھربوجا، افریقہ، اپھریکا بن جائے گا ٹیلی فون ٹیلی پھون، فرانس پھرانس۔ فرکس پھِکس ہو جائے گی۔ اسی طرح اُردو کے لیے ناگری رسم خط اور زیادہ ناموزوں ہو گیا ہے۔

اگر کسی حیثیت سے ناگری تحریر اردو تحریر سے بہتر ٹھہرے تو بھی اس حقیقت کا انکار نہ کیا جا سکے گا کہ ناگری خط ہندستان کے بعض حصوں کے سوا دُنیا کے کسی اور خطے میں مستعمل نہیں ہے اور اُردو رسم خط وہ ہے جو ایشیا کے کئی ملکوں، یورپ کے بعض خطوں اور افریقہ کے ایک بڑے حصے میں رائج ہے اور دُنیا کی کئی زبانیں انہیں حرفوں میں لکھی جاتی ہیں۔ اس لیے اگر ہندستان

www.taemeernews.com

کو ان تمام ملکوں سے سیاسی، تجارتی اور تہذیبی تعلقات قائم کرنا ہیں تو اُردو زبان کے ساتھ فارسی خط کو بھی باقی رکھنا ضروری ہے۔ فارسی خط تو ہندوستان میں صدیوں سے رائج ہے، اس کو ترک کرنے کا کیا ذکر، اگر ہندوستان کو اپنے پڑوس کے ملکوں سے ہر طرح کے تعلقات قائم کرنا ہیں تو اس کو عربی، چینی، جاپانی، روسی وغیرہ کے رسم خط بھی سیکھنا پڑیں گے۔

اُردو کی تحریر کو اور زیادہ آسان بنانے کے خیال سے بعض لوگوں کی تجویز ہے کہ ث۔ ح ذ۔ ص۔ ض۔ ط۔ ظ۔ ع۔ یہ آٹھ حروف اُردو کے حروفِ تہجی سے خارج کر دیئے جائیں۔ اس لیے کہ جو آوازیں ان حرفوں سے ادا کی جاتی ہیں۔ ان کے لیے دوسرے حروف موجود ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان میں کا ہر حرف ایک مخصوص آواز کی علامت ہے جو کسی دوسرے حرف سے ظاہر نہیں کی جاسکتی۔ ان حرفوں کی مخصوص آوازوں کو ہم ادا بھی کر سکتے ہیں، مگر بالعموم ایسا نہیں کرتے بلکہ ث اور ص کو س کی طرح ذ ض ظ کو ز کی طرح، ح کو ہ کی طرح اور ع کو الف کی طرح ادا کرتے ہیں۔ اس طرح یہ آٹھ حرف زائد اور بے ضرورت معلوم ہونے لگتے ہیں۔ یہ حرف تحریر میں کچھ دشواریاں بھی پیدا کرتے ہیں۔ مگر وہ کون سا رسم خط ہے جس میں اس طرح کی دشواریاں نہیں ہیں اور جس کے صرف حروف سیکھ لینے سے تمام الفاظ صحیح لکھے اور پڑھے جا سکتے ہیں؟ ان حرفوں کی وجہ اردو کے بہت سے لفظوں کا املا یاد رکھنا پڑتا ہے اور اس کے لیے کافی مشق کی ضرورت ہے لیکن یہی دقت ناگری تحریر میں بھی ہے جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے اور یہی وقت اُردو اور ناگری دونوں سے کہیں زیادہ رومن تحریر میں موجود ہے۔ یہ حروف بظاہر بے کار معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا ایک فائدہ یہ ہے کہ وہ لفظ جو تلفظ میں یکساں اور معنوں میں مختلف ہیں جب لکھ دیئے جاتے ہیں تو املے کے اختلاف سے اپنے معنی خود بتا دیتے ہیں۔ جیسے نال اور نعل، نظیر اور نذیر، ثواب اور صواب، کسرت اور کثرت، علم اور الم، عام اور آم۔ عائل اور آئل، تعل اور تال، ذکی اور زکی، اسیر اور اثیر، ہریرا ور سریر، ہار اور حار، باز اور بعض، عرض اور ارض، عیال اور ایال، سفر اور صفر۔ تاتا اور طعنہ، صورت اور سورت، صور اور سور، حل اور ہل، جالی اور جعلی۔ عرضی اور ارضی جن لفظوں کے تلفظ یکساں اور معنی مختلف ہیں۔ اگر ان کا املا بھی یکساں ہو جائے، تو جو غلط فہمیاں ابھی صرف کانوں کے ذریعے سے ہوتی ہیں۔ وہ آنکھوں کے ذریعے بھی ہونے لگیں گی۔

ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں، جن سے معلوم ہو گا کہ ان حرفوں کو نکال ڈالنے سے لفظوں کی صورت کیا سے کیا ہو جائے گی۔

موجودہ صورت	مجوزہ صورت
حضرت	ہزرت
عرض	ارز
صاحب	ساہب
طرح	ترہ
حفیظ	ہفیز

www.taemeernews.com

جن لوگوں کی نگاہیں ترہ، ارزا اور ہرزرت کی عادی ہو جائیں گی۔ وہ طرح، عرض حضرت کو کیونکر پڑھیں گے۔ اگر ان کی تعلیم کو اعلیٰ منزلوں میں یہ خارج کیے ہوئے حرف سکھا بھی دیے جائیں تو بھی ان لفظوں کو ان صورتوں میں پڑھنا ان کے لیے بہت دشوار ہوگا۔ بات یہ ہے کہ کوئی لفظ ایک ایک حرف کو ٹٹول کر اور ہجے لگا لگا کر نہیں پڑھا جاتا۔ بلکہ اس کی معین صورت اس کے تلفظ کی ایک مستقل علامت بن کر ذہن میں نقش ہو جاتی ہے اور صورت، تلفظ اور معنی میں ایک ایسا ارتباط پیدا ہو جاتا ہے کہ ادھر لفظ کی صورت آنکھوں کے سامنے آئی ادھر وہ پڑھ بھی لیا گیا۔ صورت بدل جانے سے لفظ کا پڑھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے اور اس کے سمجھنے میں بھی دیر لگ جاتی ہے۔ یعنی اس کے پڑھنے اور سمجھنے میں دماغ پر معمول سے زیادہ زور دینا پڑتا ہے۔

ناگری میں ساکن آوازیں نظر انداز کر دی گئی ہیں اور زبر کی حرکت ہر آواز کی فطری حرکت مان لی گئی ہے۔ اس کی فطری حرکت قرار دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مثلاً مَ پر اوٓ کا ماترا اور گ پر ایٓ کا ماترا لگانے سے مَوٓ اور گیٓ کی آوازیں نکلنا چاہیے اور اس کو مَوٓ اور گیٓ پڑھنا اصولاً صحیح نہ ہوگا۔ بلکہ ان آوازوں کا ناگری حرفوں سے ادا کرنا ممکن نہ ہوگا۔

فارسی زبان اردو کے لیے ایک بنیادی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں اور اردو میں ماں بیٹی کا تعلق ہے۔ عربی سے بھی اردو کو برابر تقویت پہنچتی رہی ہے۔ ان دونوں زبانوں کا رسم خط تقریباً بالکل وہی ہے جو اردو کا ہے۔ اس لیے اگر اردو کا تعلق فارسی عربی سے باقی رکھنا ہے تو اس کے موجودہ رسم خط کا باقی رکھنا بھی ضروری ہے۔ رومن ہو یا کوئی دوسرا رسم خط وہ اس تعلق کو قطع کر دے گا، اور یہ اردو کے لیے بے حد مضر ہوگا۔

حروف کی تبدیلی سے ایک بڑا نقصان یہ ہوگا کہ ہزارہا کتابیں جو اب تک لکھی جا چکی ہیں اور لاکھوں روپیے کے صرف سے چھاپی جا چکی ہیں وہ بے کار اور رفتہ رفتہ مفقود ہو جائیں گی۔ اردو کے کل کتابی ذخیرے کو نئے رسم خط میں منتقل کرنا عملاً محال ہے۔ حرفوں کی تبدیلی سے ایک نقصان یہ بھی ہوگا کہ حساب جمل کا وجود نہ رہے گا اور بے شمار تاریخی نام اور قطعاتِ تاریخ جو جودتِ طبع اور قوتِ تلاش کے حیرت خیز مظاہرے ہیں اور گزشتہ حالات و واقعات کا زمانہ معین کرنے میں بہت کار آمد ثابت ہوئے ہیں، سب بے کار ہو جائیں گے۔

یہ چند باتیں جو ابھی بیان کی گئی ہیں ان پر غور کرنے سے واضح ہو جائے گا کہ کسی زبان کے لیے جو رسم خط صدیوں تک استعمال ہوتا رہتا ہے۔ اس میں اور اس زبان میں طرح طرح کے بڑے گہرے اور دور تک پہنچنے والے تعلق قائم ہو جاتے ہیں اور زبان کے رگ ریشے میں اس طرح بھد جاتا ہے کہ اس کو بدل دینے سے زبان کی صورت کے ساتھ اس کی روح کا بدل جانا بھی ضروری ہے۔ مختلف پہلوؤں سے نظر کرنے کے بعد یہ ضروری ٹھہرتا ہے کہ اردو کا موجودہ رسم خط برقرار رکھا جائے۔ اپنی خاص ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اس میں اصلاحیں کی جا سکتی ہیں۔ مگر صرف ایسی جو اس کی صورت کو مسخ نہ کریں۔ آج کل بعض لوگ اردو کے لیے نئے نئے خط ایجاد کر رہے ہیں۔ ان صاحبوں سے درخواست ہے کہ وہ ایجاد کی زحمت میں نہ پڑیں اصلاح کی مناسب صورتیں تجویز کریں۔"

مسٹر گاندھی اور دوسرے ہندو ماہرانِ تعلیم نے اردو کے لیے جس رسم خط کو تجویز کیا ہے۔ اس پر مسلمان زعماء نے اپنے

www.taemeernews.com

اپنے خیالات کا اظہار دلائل کے ساتھ کر دیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُردو کے لیے اس کے موجودہ رسم خط کی تبدیلی اس زبان کے لیے کند چھری سے ذبح کرنے کے مترادف ہے۔ چنانچہ مثالیں دے کر اس مُوقف کی وضاحت کی جا چکی ہے اور ہندی ساہتیہ سمیلن کی اردو دشمنی کھُل کر سامنے آ چکی ہے۔ اُردو کے لیے ناگری رسم خط اختیار کرنے کی تمام تجاویز اردو کے لیے محض بیکار ہی نہیں بلکہ اس زبان کو مٹانے کی نشان دہی کرتے ہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو

رسم الخط کے مسئلے پر پنڈت جواہر لال نہرو کے خیالات ہم رسالہ اُردو ۱۹۳۶ء بابت ماہ جولائی سے ذیل میں پیش کرتے ہیں۔ اس ہندوستان کے ایک بہت بڑے مفکر اور سیاست دان کا ایک واضح مُوقف بھی ہمارے سامنے آتا ہے:-

"ہم نے شادی[1] کا جو چھوٹا سا دعوت نامہ تقسیم کیا وہ ہندوستانی میں لکھا اور رومن حروف میں چھپا تھا۔ یہ ایک جدت تھی کیونکہ ایسے رقعے یا تو ناگری میں چھاپے جاتے ہیں یا فارسی رسم الخط میں۔ رومن میں ہندوستانی لکھنے کا چلن پادریوں اور فوجیوں کے علاوہ اور کہیں نہیں۔ میں نے رومن رسم الخط کا استعمال تجربے کے طور پر کیا تھا۔ تاکہ مختلف لوگوں پر اس کے اثر کا مطالعہ کروں۔ کچھ نے اس جدت کو سراہا۔ مگر بہتوں کو میرا یہ فعل نہ بھایا۔ رقعے تھوڑے سے لوگوں میں تقسیم ہوئے تھے۔ اگر زیادہ لوگوں کو بھیجے جاتے تو مخالفوں کی تعداد اور زیادہ نکلتی۔ گاندھی جی نے اسے پسند نہیں کیا۔

میں نے رومن خط کا استعمال اس وجہ سے نہیں کیا تھا کہ میں اس کا معتقد ہو گیا تھا۔ گو یہ صحیح ہے کہ ایک عرصے سے میرا میلان اس طرف تھا۔ ترکی اور وسط ایشیا اس کی کامیابی نے مجھے متاثر کیا تھا اور اس کے موافق جو بین دلائل تھے۔ وہ بڑے وزنی تھے۔ یہ ہوتے ہوتے بھی میں اس کا پورا پورا قائل نہ ہوا تھا اور اگر ہو بھی جاتا تو بھی مجھے یہ خوب معلوم تھا کہ موجودہ ہندوستان میں اس کے رواج کے متعلق کوئی اُمید نہیں ہے۔ قوم پرور اور مذہبی لوگ، ہندو اور مسلمان، جوان اور بوڑھے غرض کہ ہر جماعت شدت سے اس کی مخالفت کرے گی اور مجھے اس کا بھی احساس ہے کہ مخالفت کی بنیاد محض جذباتی نہ ہوگی۔ ایک شاندار ماضی کی وارث زبان کے لیے رسم خط کی تبدیلی بہت زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ رسم خط اور زبان میں چولی دامن کا رشتہ ہے۔ رسم خط بدل کر دیکھو کہ لفظوں کی شکل ہی بدل گئی ہے۔ اُن کی آواز بھی بدل گئی ہے اور ساتھ ساتھ خیالات بھی بدل گئے ہیں۔ اس کے بعد قدیم و جدید ادب میں ایک ناقابل عبور حد فاصل آ جاتی ہے اور پرانی زبان ہمارے لیے اجنبی اور مُردہ ہو جاتی ہے جس زبان کا کوئی ادبی سرمایہ نہ ہو وہ ان جوکھوں سے کھیل سکتی ہے۔ ہندوستان میں تو میں اس قسم کے تغیر کا گمان بھی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ہمارا ادب نہ صرف قیمتی اور وسیع ہے۔ بلکہ وہ ہماری تاریخ اور دماغ میں پیچ پیچ گیا ہے اور عوام کی زندگی میں گھل مل گیا ہے۔ اس

---

[1] یہ واقعہ پنڈت جی کی بہن کی شادی کا ہے۔

www.taemeernews.com

قسم کا تغیر ایک طالمانہ قطع و برید ہوگی جو عام تعلیم کے چلن میں سدِ سکندری بن جائے گی۔

مگر آج کل کے ہندستان میں تو اس بحث کی نوعیت علمی بھی نہیں ہو سکتی۔ اصلاح رسم خط کی دوسری صورت میری رائے میں یہ ہو سکتی ہے کہ سنسکرت نژاد زبانوں یعنی ہندی، بنگالی گجراتی اور مرہٹی کے لیے ایک عام رسم خط قبول کر لیا جائے حقیقت یہ ہے کہ ان سب کے رسم خط ایک ہی سوت سے نکلے ہیں اور ان میں زیادہ فرق بھی نہیں ہے۔ لہٰذا ان میں آسانی سے سمجھوتا ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوگیا، تو چاروں بہنیں ایک دوسرے سے بہت قریب ہو جائیں گی۔

ہمارے انگریز حکمرانوں نے ہندوستان کے متعلق ایک یہ افسانہ بھی دنیا میں پھیلا رکھا ہے کہ ہمارے ملک میں سیکڑوں زبانیں (مجھے صحیح تعداد یاد نہیں) رائج ہیں، ثبوت کے لیے مردم شماری کی رپورٹ دیکھ لیجیے۔ یہ عجیب بات ہے کہ بہت کم انگریز ہیں جو ان سیکڑوں زبانوں میں سے ایک آدھ میں بھی کچھ شُد بُد جانتے ہوں۔ حالانکہ وہ زندگی کا بہت بڑا حصہ یہیں گزارتے ہیں۔ ہماری زبانوں کے لیے انھوں نے 'ورنیکلر' کا نام تجویز کیا ہے۔ یہ لاطینی کا مرکب لفظ ہے 'ورنا' کے معنی غلام ہیں اور 'ورناکلر' کے معنی غلاموں کی زبان۔ بہت سے ہندوستانیوں نے لاعلمی میں اس نام کو اپنا لیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ہندوستان میں زندگی گزار دینے کے باوجود انگریز یہاں کی زبان سیکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اپنے خانساماؤں اور آیاؤں کی بدولت انھوں نے ایک عجیب و غریب بولی بنائی ہے۔ اس بگڑی ہوئی ہندوستانی کو وہ اصل زبان سمجھ بیٹھے ہیں جس طرح وہ اپنے ماتحتوں اور خوشامدیوں سے ہندوستانی زندگی کے حقائق معلوم کرتے ہیں۔ اسی طرح ہندوستانی کا علم وہ اپنے نوکروں سے حاصل کرتے ہیں اور یہ نوکر جان بوجھ کر زبان کو توڑ مروڑ کر استعمال کرتے ہیں کہ صاحب لوگ کہیں کچھ نہ کچھ نہ سمجھ بیٹھیں۔ غالباً انھیں مطلق علم نہیں ہوتا کہ ہندوستانی اور دوسری دیسی زبانوں کا ادبی معیار بلند اور ادبی ذخیرہ وسیع ہے۔

اگر مردم شماری کے اعداد ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ ہندوستان میں دو تین سو زبانیں ہیں اور وہی اعداد یہ بھی کہتے ہیں کہ جرمنی میں پچاس ساٹھ زبانیں رائج ہیں، مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کسی نے اس واقعے کو اہل جرمن کے باہمی نفاق و اختلاف کے ثبوت میں پیش کیا ہو۔ سچ پوچھو تو مردم شماری کی رپورٹ میں ہر قسم کی اہم اور غیر اہم زبانوں کا ذکر ہوتا ہے۔ ایسی زبان کا شمار بھی ہوتا ہے جس کے بولنے والے صرف چند ہزار ہیں۔ لسانیاتی وجوہ سے مقامی بولیوں کا شمار زبانوں میں کر دیا جاتا ہے لیکن رقبے کو دیکھتے ہوئے میرے خیال میں ہندوستان میں زبانوں کی تعداد بہت کم ہے۔ یورپ کے اتنے ہی بڑے رقبے سے مقابلہ کر کے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ زبان کے معاملے میں ہندوستان میں کہیں زیادہ یگانگت ہے گو عام جہالت کی وجہ سے مقامی بولیوں کو فروغ مل گیا ہے اور ان کے اتحاد کی صورت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ برما کو چھوڑ کر ہندوستان کی خاص زبانیں حسب ذیل ہیں۔ ہندوستانی اس کی دو شاخیں ہیں (ہندی اور اردو) بنگالی، گجراتی، مرہٹی، تامل، تیلگو، ملیالم اور کنڑی، اگر اس فہرست میں آسامی، اڑیا اور جنگلی قبیلوں کے علاوہ پورے ملک کی تقسیم ہو جاتی ہے ان میں بھی انڈو آرین زبانیں باہم بہت قریبی رشتہ رکھتی ہیں اور ہندوستان کے شمال، مشرق، وسط اور مغرب میں پھیلی ہوئی ہیں۔ دکن کی دراوڑی زبانیں مختلف ہیں تاہم ان پر سنسکرت کا بڑا اثر ہے اور سنسکرت کے بہتیرے الفاظ ان میں مل گئے ہیں۔

www.taemeernews.com

حسب بیان بالا آٹھ بڑی بڑی زبانوں کے ادب بیش بہا اور قدیم ہیں۔ ان میں سے ہر ایک بہت بڑے علاقے میں پھیلی ہوئی ہے جس کے حدود متعین و مخصوص ہیں۔ بولنے والوں کی تعداد کے نقطۂ نظر سے ان زبانوں کی گنتی دنیا کی بڑی زبانوں میں ہو سکتی ہے۔ پانچ کروڑ آدمی بنگالی بولتے ہیں اور ہندوستان کی مختلف اقسام کے بولنے والوں کی تعداد میرے پاس صحیح نہیں ہے۔ میرے خیال میں ۱۴ کروڑ سے کم نہیں۔ علاوہ بریں پورے ملک میں اس کے سمجھنے والے ان گنت ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی زبان کے فروغ کے وسیع امکانات ہیں۔ سنسکرت پر اس کی بنیاد ہے۔ فارسی سے اس کا قریبی رشتہ ہے یعنی وہ دو مخزنوں سے مدد حاصل کر سکتی ہے اور اب تو اس نے انگریزی زبان سے بھی ناتا جوڑنا شروع کر دیا ہے۔ دکن کے دراوڑی صوبے ہی ایسے ہیں، جہاں اس زبان کی حیثیت غیر ملکی ہے۔ مگر وہاں کے باشندے بھی اسے سیکھنے کی دل و جان سے سعی کر رہے ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں مَیں نے ایک سبھا کی رپورٹ دیکھی تھی جو دکن میں ہندی پرچار کا کام کر رہی ہے۔ اس کے قیام کے ۱۴ سال بعد تک صرف صوبۂ مدراس میں اس نے ساڑھے پانچ لاکھ آدمیوں کو ہندی سکھا دی تھی۔ ایک غیر سرکاری ادارے کی یہ سعیٔ بلیغ قابلِ ذکر ہے۔ جو لوگ ہندی سیکھتے ہیں ان میں سے اکثر اس مقصد کے مُبلّغ بن جاتے ہیں۔

مجھے اس کا یقین ہے کہ ہندوستانی اس ملک کی عام زبان ہو کر رہے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ معمولی کام کاج میں آج بھی اس کی حیثیت یہی ہے۔ اس کی ترقی میں دو احمقانہ مباحث حائل ہو گئے ہیں۔ ایک تو ناگری اور فارسی رسمِ خط کا سوال اور دوسرے فارسی یا سنسکرت الفاظ کی بھرمار کی غلط تحریک رسمِ خط کی مشکل کا کوئی حل سمجھ میں نہیں آتا۔ کیونکہ اس کا نام آتے ہی آتشِ غضب بھڑک اُٹھتی ہے۔ یہی ہو سکتا ہے کہ سرکاری طور پر دونوں کو تسلیم کر لیا جائے اور لوگوں کو دونوں کے استعمال کی اجازت دی جائے لیکن انتہا پسند رجحانوں کو روکنے اور بول چال کی زبان کی نہج پر کوئی درمیانی ادبی زبان بنانے کی جدّ و جہد جاری رکھنا ضروری ہے۔ عام تعلیم کے بعد یہی ہو کر رہے گا۔ اس وقت کو متوسط طبقے کے وہ تھوڑے سے لوگ جو ادبی ذوق و اسلوب کے سرپنچ بنے ہوئے ہیں بہت ہی تنگ خیال اور اپنے اپنے دائرے میں سخت رجعت پرور ہیں فرسودہ اور بے جان طرزوں سے وہ جونک کی طرح چمٹے ہوئے ہیں اور ادبِ عالم یا اپنے ہاں کے عوام سے اُن کا تعلق برائے نام ہے۔

ہندوستانی کی اُٹھان اور پھیلاؤ کے یہ معنی نہیں کہ وہ بنگالی، گجراتی، مرہٹی اور دکن کی دراوڑی زبانوں کے رواج اور فروغ میں سدِ راہ بنے۔ ان میں سے بعض تو ہندوستانی سے زیادہ بے زار اور علمی اعتبار سے زیادہ باخبر ہیں اپنے اپنے علاقوں میں وہ تعلیم اور دوسرے کاموں کے لیے سرکاری زبانیں تسلیم کی جائیں گی۔ صرف ان ہی کی وساطت سے عوام میں تہذیب اور تعلیم کی روشنی جلد پھیل سکتی ہے۔ کچھ لوگ تصور کرتے ہیں کہ انگریزی بھی ہندوستان کی قومی زبان ہو سکتی ہے۔ طبقۂ اعلیٰ کے مٹھی بھر عالموں کا ذکر نہیں ہے ورنہ مجھے تو یہ تصور بالکل خیال معلوم ہوتا ہے۔ تعلیمِ عامہ اور تہذیب کے مسائل سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ ممکن ہے کہ صنعتی، علمی اور کاروباری امور میں اور خصوصاً بین الاقوامی تعلقات کے لیے رفتہ رفتہ انگریزی کا استعمال

www.taemeernews.com

بڑھتا جائے گا۔ ایک حد تک آج بھی یہی معاملہ ہے افکار و اشغالِ عالم سے باخبر رہنے کے لیے ہم میں سے بعض کو بیرونی زبانوں کا علم لازمی طور پر حاصل کرنا ہوگا۔ اور میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ہماری یونیورسٹیاں انگریزی کے علاوہ فرینچ، جرمن، روسی، اسپینی اور اطالوی کی تعلیم کا بھی انتظام کریں۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ انگریزی سے کنارہ کشی اختیار کی جائے لیکن اگر دنیا کے متعلق صحیح توازن قائم کرنا ہے، تو محض انگریزی عینکوں سے کام نہ چلے گا۔ صرف ایک پہلو اور ایک نظریے پر ارتکاز کی وجہ سے ہماری ذہنیت بہت کچھ یک رُخی ہو چکی ہے اور ہمارے سخت سے سخت قوم پرست بھی اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ہندوستان کے متعلق برطانوی نقطۂ نظر نے ان کے زاویۂ نگاہ کو کس قدر محدود اور مسخ کر دیا ہے۔

دوسری غیر زبانوں کی تحصیل کی ہم کتنی ہی ترغیب کیوں نہ دیں مگر بیرونی دنیا سے ہمارے واسطے کا سب سے اہم ذریعہ انگریزی زبان ہی ہوگی۔ ایسا ہونا بھی چاہیے۔ ایک مدّت سے ہم انگریزی سیکھنے کا جتن کر رہے ہیں اور اس میں ہمیں بڑی حد تک کامیابی بھی ہوتی ہے۔ سارے کئے دھرے پر پانی پھیرنے اور اس طویل تربیت سے فائدہ نہ اٹھانے کا خیال سراسر احمقانہ ہے۔ بلاشبہ انگریزی دُنیا کی اہم اور مقبول زبان ہے اور وہ تیزی سے دوسری زبانوں سے آگے بڑھ رہی ہے اور وہ دُنیا میں بین الاقوامی بھر بار اور نشر لاسلکی کا ذریعہ ہوتی جاتی ہے۔ یہ دیکھنا کہ 'امریکن' اس کا نمبر نہ چھین لے۔ اس لیے ہمیں انگریزی زبان کی اشاعت کرنا چاہیے۔ اس پر جتنا عبور حاصل کیا جائے۔ اچھا ہی ہے لیکن مجھے ہرگز پسند نہیں ہے کہ اس زبان کی نزاکتیں اور باریکیاں سمجھنے میں بہت زیادہ وقت اور ذہانت ضائع کی جائے۔ اکّے دُکّے آدمی ایسا کیا کریں مگر اسے ایک عام مقصد بنا دینے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں پر فضول بار لادا جائے اور انہیں دوسرے کاموں میں ترقی حاصل کرنے سے روکا جائے۔

بنیادی انگریزی (BASIC ENGLISH) کی طرف اب میں بہت توجّہ کرنے لگا ہوں اور میری رائے یہ ہے کہ یہ غیر معمولی سہولت جو زبان میں پیدا کی گئی ہے اس کا مستقبل اُمید افزا ہے۔ بہتر تو یہ ہو کہ ہم بڑے پیمانے پر بنیادی انگریزی کی اشاعت شروع کردیں اور معیاری انگریزی کو ماہروں اور شوقین طلبہ کے لیے چھوڑ دیں۔ میں ذاتی طور پر یہ پسند کروں گا کہ ہندوستانی دوسری غیر ملکی زبانوں اور انگریزی کے الفاظ کو اپنانے اور رواج دینے کی صلاحیت پیدا کرے۔ یہ ضروری بھی ہے کیونکہ ہمارے پاس جدید اصطلاحات نہیں ہیں اور سنسکرت، فارسی یا عربی سے غیر مانوس و ادق ترکیبیں وضع کرنے کے بدلے عام فہم الفاظ کو اختیار کر لینا زیادہ مناسب ہے۔ خالص زبان کے معتقد (PURIST) پردیسی الفاظ کے استعمال پر اعتراض کرتے ہیں مگر ان کی غلطی ہے کیونکہ ہماری زبان اس وقت مالا مال ہوگی جب کہ اس میں ایسا لوچ ہو کہ وہ دوسری زبانوں کے الفاظ اور خیالات کو اپنانے کی صلاحیت پیدا کرے۔

اپنی بہن کی شادی کے بعد میں اپنے پُرانے دوست اور ہم کار شیو پرشاد گپتا سے ملنے کے لیے بنارس گیا۔ وہ سال سوا سال سے بیمار پڑے تھے۔ لکھنؤ جیل میں ان پر فالج گرا اور اب وہ بہت دھیرے دھیرے تندرست ہو رہے تھے۔ قیامِ بنارس کے دوران ہندی کی ایک چھوٹی سی ادبی انجمن نے مجھے ایڈریس دیا اور اس موقع پر اس کے ارکان سے

www.taemeernews.com

میری گفتگو ہوئی۔ مَیں نے مشورہ دینے سے پہلے جتا دیا کہ ایسے معاملات پر جن کے متعلق میرا علم محدود ہے، ماہران فن سے کہتے ہوئے مجھے تامل ہوتا ہے۔ میں نے ہندی کی پُر تکلف اور پیچیدہ عبارت آرائی پر تنقید کی جو مشکل سنسکرت الفاظ سے بھری ہوئی ہے جس میں تصنع ہوتا ہے اور جو فرسودہ اسالیب کی نقل ہے۔ یہ طور عام ہے۔

مَیں نے یہ رائے دینے کی جرأت کی کہ اس درباری اسلوب کا تخاطب چند لوگوں سے ہو سکتا ہے اور اسے جلد چھوڑ دینا چاہیے۔ ہندی کے مصنفوں کو ارادتاً عوام کے لیے لکھنا چاہیے یعنی ایسی زبان میں جو عوام کی سمجھ میں آ سکے۔ عوام کا تعلق زبان میں نئی رُوح پھونکے گا اور اسے اخلاص کا جوہر عطا کرے گا۔ عوام کے جذبات کی قوت مصنفوں پر بھی اثر ڈالے گی اور وہ زیادہ بہتر کام کرنے لگیں گے۔ مَیں نے یہ بھی کہا کہ اگر ہندی کے مصنف مغربی علم و ادب کی طرف زیادہ توجہ کریں تو انہیں بڑا فائدہ ہو گا۔ یورپی زبانوں کی اعلیٰ تصانیف اور جدید خیالات کی حامل کتابوں کے تراجم بہت سُود مند ہوں گے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ غالباً جدید بنگالی گجراتی اور مرہٹی زبانیں ان معاملات میں نئی ہندی سے کسی حد تک آگے ہیں اور اس امر میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ زمانہ حال میں بنگالی میں ہندی سے کہیں زیادہ تخلیقی کام ہوا ہے۔

ان معاملات پر ہماری بات چیت دوستانہ تھی۔ پھر میں وہاں سے چلا آیا۔ مجھے مُطلق خیال نہ تھا کہ میری رائے اخباروں کو بھیج دی جائے گی۔ مگر کسی نے جو اس صحبت میں شریک تھا۔ اس گفتگو کی رپورٹ ہندی پریس میں اشاعت کے لیے بھیج دی۔

پھر تو ہندی اخباروں نے میرے خلاف بڑا واویلا مچایا۔ ہندی کو بنگالی، گجراتی اور مرہٹی سے ہیٹا بتلانے کی وجہ سے مجھے خوب صلواتیں سُنائی گئیں۔ مجھے جاہل بتایا گیا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس معاملے میں میرا علم بہت محدُود تھا۔ مجھ پر دباؤ ڈالنے کے لیے اور بھی سخت باتیں کہی گئیں۔ اس مباحثہ کے لیے میرے پاس وقت نہ تھا اور بعد میں مجھے معلوم ہُوا کہ یہ شورش مہینوں جاری رہی حتیٰ کہ مَیں پھر جیل چلا گیا۔

اس واقعے سے مجھے ایک نئی بات معلوم ہُوئی اور اس سے ہندی کے ادیبوں اور اخبار نویسوں کی غیر معمولی زُود حسی کا راز کھل گیا اور یہ پتا چل گیا کہ ایک بہی خواہ کی تھوڑی سی مُخلصانہ تنقید کو بھی وہ سُننا گوارا نہیں کرتے۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ اپنی پستی کا وہم تھا۔ یہ تو اکثر ہُوا کہ مصنف اور نقاد باہم دست و گریباں ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے پر ذاتی بغض و حسد کا الزام لگاتے ہیں مگران کا (میرے معترضین کا) زاویہ نگاہ نہایت ہی تنگ، فرسُودہ اور سرمایہ دارانہ تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ مصنف اور اخبار نویس ایک دوسرے کے لیے اور ایک محدُود دائرے کیلئے لکھتے ہیں اور عوام اور ان کے مفاد سے انہیں کوئی تعلق نہیں ہے جب کہ انہیں نیا اور وسیع میدان مل سکتا ہے، تو ان کا یہ طرز عمل قابل رحم ہے کیونکہ یہ صلاحیت کی بربادی کے سوا کچھ نہیں ـــــ ہندی ادب کا ماضی شاندار ہے مگر وہ اپنی ماضی کے بوتے ہمیشہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا مستقبل روشن ہے اور ہندی اخبار نویس اس ملک کی قابل قدر طاقت ثابت ہوں گے لیکن اس وقت تک ان کی ترقی محال ہے۔ جب تک فرسودہ پابندیوں سے آزاد نہ ہو جائیں اور جرأت کر کے عوام کو اپنا مخاطب نہ بنائیں۔"

(پنڈت جی کی خود نوشت سوانح عمری کے ایک باب سے ماخوذ)

www.taemeernews.com

اُردو اور اہلِ زبان

معرکہ آرا: شیرِ پنجاب اور دوسرے اہلِ زبان

بعض دینی کتب میں درج ہے کہ طوفانِ نوح کے بعد بوجہ انانیت اور جہالت کے لوگوں کو ایک قسم کی ضد ہو گئی کہ دیکھیں سیلاب اور طوفان بحری اب کیسے تباہ کر سکتا ہے چنانچہ انہوں نے ایک سربفلک تعمیر بنائی جسے بابل کا مینار کہتے ہیں اللہ تعالےٰ کو یہ سرکشی اور غرور پسند نہ آیا چنانچہ ان کی زبان یعنی بولی میں قدرت نے اختلاف ڈال دیا۔ ایک صبح جو وہ اُٹھے تو سب اپنے اڑھائی چاول الگ الگ پکاتے ہیں۔ ہر شخص اپنی زبان کو امتیازی اور افضل بتاتا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ طوفان تو جب آتا تب آتا۔ مینارِ بابل طاق پہ دھرا رہا اور وہ ساری قوم آپس میں کٹ مری۔ یہی کیفیت ہم کچھ عرصہ سے ان اصحاب کی دیکھ رہے ہیں جو اپنے آپ کو اردو کا واحد مالک اور مورث ہونے کا اعلان کرتے ہیں اور بضد ہیں کہ وہ اور بس وہی اہلِ زبان اور اردو کے حکم ہیں۔ اُن کا یہ دعوےٰ واجب ہے یا ناواجب اور خاص خاص مشاہیر عالم اردو پر جو حملے ان کی طرف سے ہوتے ہیں وہ بجا ہیں یا بیجا اس سے مضمون ہذا میں بحث کی جائے گی۔ بھلا ایسے تنگ ظرف اور کم بیں کبھی اردو کو ملک کی زبان بنانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ بلکہ وہ تو بابل کے گمراہوں کی طرح آپس میں ہی کٹ کٹ کے مر رہے ہیں۔ انھوں نے یہ شیوۂ شنیعہ اختیار کر لیا ہے کہ جو کوئی اردو کا اچھا لکھنے والا اُٹھے اور وہ ان کی اصطلاح کے بموجب اہلِ زبان نہ ہو اسے گرانے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں افسوس ہے کہ ہمیں ایک ناگوار فرض بھی ادا کرنا پڑے گا۔ یعنی دہلی اور لکھنؤ (یہی دو شہر مدعیانِ اُردو کے زعم میں اُردو کے مرکز کہے جاتے ہیں) کے جو بڑے استادِ اردو کے مانے جاتے ہیں یا مانے جا سکتے ہیں ان کے کلام کا موازنہ کرنا زبان اور استدلال کے اصول کے اعتبار سے۔ نیز ہم یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے اور واقعات مسلّمہ سے دکھائیں گے کہ دہلی اور لکھنؤ والے نہ تو اصل میں اُردو کے بانی تھے اور نہ ہی اس کو واقعی ترقی دینے والے۔ یہ بات دوسری ہے کہ ان کے گھروں میں حکومت تھی اور اِدھر اُدھر کے اہلِ کمال ان کے دروازے پر آ کر اپنا گزارہ چلاتے اور ان کی تال پہ گاتے۔ جو ناچ یہ نچاتے ناچتے۔ اس طرح سے دہلی اور لکھنؤ والوں کی حیثیت قاضی کے گھر کے چوہوں کی سیانپ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی مگر چوہے بھی وہ کہ جونپور کے قاضی کے گھر ہوں۔

پنجاب اوّل سے ان لوگوں کی نظروں میں کھٹکتا رہا ہے۔ اور اُسے ہمیشہ حسد کی نگاہوں سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ اب جو انہوں نے دیکھا کہ اُردو شاعری کے نئے سکول (جسے ہم بغرض سہولت نیچرل شاعری کہیں گے) کی بنا بھی پنجاب ہی میں رکھی گئی اور زندہ دلانِ پنجاب میدانِ سخن میں وہ جولانیاں دکھا رہے ہیں جس کی گرد کو بھی اہلِ زبان نہیں پہنچ سکتے تو اُن لوگوں نے بجائے اس کے کہ کلام کو کلام سے پست کرتے متعصبانہ تنقید کی آڑ لی اور ہٹ دھرمی پہ کمر باندھی۔ مگر یاد رہے کہ جس طرح پنجاب فارسی کے باب میں ہندوستان کے دارالخلافوں کو شکست دے چکا ہے اسی طرح اردو میں بھی دے گا

www.taemeernews.com

معنی دے رہا ہے۔ ہم آگے چل کر ثابت کریں گے کہ دہلی اور لکھنؤ کے لوگوں نے ترقی دینے کی بجائے اُردو کو بگاڑا ہے۔

ہم یہ دعوےٰ کرتے ہیں کہ اُردو یا ہندوستانی[2] یا جو کچھ اس کا نام رکھو پنجاب میں پیدا ہوئی اور پنجابی اس کے بانی تھے۔ اس کا ثبوت بخوفِ طوالت مجمل طور پر ذیل میں دیا جاتا ہے۔

آزاد مرحوم آبِ حیات میں تحریر فرماتے ہیں:-

"اُردو زبان اوّل لین دین نشست برخاست کی ضرورتوں کے لئے پیدا ہو گئی ہندوؤں کے ساتھ ہندی مسلمان جو اکثر ایرانیوں یا ترکستانیوں کی اولاد تھے ہندوستان کو وطن اور اس زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے۔"

ہم ان صورتوں کی واقعیت کو تسلیم کرتے ہیں مگر یہ مانتے ہوئے کہ یہ صورتیں پنجاب سے متعلق ہیں۔ دہلی یا شاہجہان آباد سے نہیں۔ اگر حالی مرحوم کا یہ کہنا تاریخی صداقت رکھتا ہے کہ ہندوستان میں پنجاب نے سب سے پہلے ؏

"رکاب اسلام کی چومی ہے اس پہ سر جھکایا ہے"

اور تاریخ ہند کا یہ واقعہ صحیح ہے کہ دہلی سے کم از کم دو سو برس پہلے پنجاب اسلام کی حکومت میں آیا تو ایرانیوں ترکستانیوں وغیرہ سے پہلے پہل پنجاب کو واسطہ پڑا نہ کہ دہلی شریف کو۔ علم زبان کا یہ ایک سادہ اصول ہے کہ جب دو مختلف زبانوں کے بولنے والے ملتے جلتے ہیں تو ایک تیسری نئی زبان پیدا ہو جاتی ہے ہم دہلی والوں سے سوال کرتے ہیں کہ اتنے برسوں تک پنجاب والے اور یہ غیر ملک والے آخر کس زبان میں باہم گفتگو کرتے رہے؟ ہم کہتے ہیں اُس زبان میں جسے آپ اُردو کہتے ہیں۔ پس اُردو کا مولد پنجاب ہے نہ کہ شاہجہان آباد[1]

مولانا آزاد نے اُردو کا جزوِ اعظم برج بھاشا اور فارسی قرار دیا ہے۔ ہمیں اُن سے اختلاف ہے۔ مولانا مرحوم برج بھاشا سے ناواقف تھے۔ ایسے ہی جیسے کہ پنجابی سے یہ دوسری بات ہے کہ انہوں نے اسی آبِ حیات میں ہندی اشعار اقتباس کئے ہیں اور وہ کئی برس پنجاب میں رہے ہیں۔ یہ ایسی ہی بات ہے۔ جیسی یہ کہ حالی مرحوم انگریزی سے نابلد ہی مانے جائیں گے خواہ وہ اپنے دیوان کے مقدمہ شعر و شاعری میں ملٹن۔ بائرن اور شیکسپیئر پر کتنی ہی لمبی چوڑی تنقیدیں کیوں نہ لکھیں۔ جاننا چاہیے کہ اُردو مرکب ہے "سورسینی بھاشا" اور "فارسی" سے[3] نہ کہ برج بھاشا اور فارسی سے۔ مولانا آزاد دہلی کے کسی ہندو کا کلام ایسا (یعنی زبان کے اعتبار سے ملا جلا) نہ دکھا سکے جیسا بابا نانک صاحب کا ہے سکھوں کے دوسرے گرو صاحبان کا کلام وحی نظام بھی اسی قبیل سے ہے۔ دہلی کے ہندو شاعر چند کا ذکر مولانا نے ضرور کیا ہے مگر اس کی نسبت دو چیزیں امور ان کی سمجھ میں نہ آئے ایک تو یہ کہ اس کا وہ زمانہ تھا جب

---

[1] ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ شاہجہان آباد۔ آگرہ یا لکھنؤ سے کوئی ایک مکمل اور جامع تصنیف فارسی کی اس حیثیت سے نہیں نکلی جسے ادب اطلے میں جگہ دی جاتی اور نصاب تعلیمی ہونے کی قبولیت حاصل ہوتی۔ مگر یہ امتیاز۔ یہ شرف بہارِ دانش اور مثنوی غنیمت کو ہی نصیب ہوا۔ ان دونوں کتابوں کے مصنف پنجابی تھے۔

[2] مصنف فرہنگِ آصفیہ نے اپنی لغات کے ابتدائی حصہ کا نام جو انیسویں صدی عیسوی میں طبع ہوا تھا ہندوستانی اردو لغات رکھا تھا۔ صرف ایک کتاب اس زبان کے علم لسان پر ہے اور اس کا نام ہندوستانی فیلولوجی ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ لفظ اُردو کوئی مستقل اصطلاحی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس جگہ غالب کا یہ شعر ذکر کے قابل ہے ؎

جو یہ کہو کہ ریختہ کیونکہ ہو رشک فارسی الخ

[3] یعنی یہ اس کے جزوِ اعظم ہیں۔

www.taemeernews.com

پنجاب نے اُردو پیدا کی تھی اور دوسرے یہ کہ وہ برج بھاشا کا شاعر نہ تھا: دہلی والوں سے پیشتر پنجاب والوں کا فارسی میں سخن سنج ہونا فارسی تذکروں سے ثابت ہے۔ خدا جانے کتنے اور پنجابی فارسی میں ایسا ہی اچھا درک رکھتے ہوں گے جیسا دسویں گرو صاحب گرو گوبند سنگھ جی کو فارسی کی انشا اور شعر گوئی میں تھا۔ خود بابا نانک صاحب نے فارسی میں گوہر فشانی فرمائی ہے۔

ایک اور امر قابلِ غور یہ ہے کہ اگر اُردو دہلی میں پیدا ہو کر وہاں سے پنجاب میں آئی ہوتی تو ضرور تھا کہ وہ اپنی خصوصیات ساتھ لاتی مگر ایسا نہیں ہوا۔ اور پنجابی کی اُردو اہلِ زبان کی اردو سے الگ پہچانی جاتی ہے۔ بلکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ پنجابی خصوصیات مشاہیر شعرائے اُردو (اہلِ زبان) کے ہاں ہر کہیں نظر آتے ہیں۔ نمونہ کے طور پر کچھ یہاں لکھے جاتے ہیں۔

کہوں کیونکہ یک بار وہ جل گیا
میر تقی — کف خاک ہو خاک میں رل گیا — (مثنوی شعلۂ عشق)

———

صیاد اب تو کر دے قفس سے ہمیں رہا
ظالم پھڑک پھڑک کے پر و بال گھس چلے
سودا — کافران آل محمدؐ یہ ستم کیا کیتا
ہائے تمتا نے اونہاں اوپر ظلم کیا کیتا

میر درد۔

. . . . نال ہولی میں
نظیر اکبر آبادی
. . . . گلال ہولی میں

بفحوائے کل شیئ یرجع الیٰ اصلہ مولانا طباطبائی کے قول کے بموجب مرزا غالب کی زبان میں بھی ان کی پنجابی خادمہ نے چند خصوصیات پنجابی پیدا کر دیں اور بقول اہل زبان آزاد کی زبان میں تو بہت پنجابیت آگئی۔

علاوہ بریں اگر یہ امر من کل الوجوہ پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتا کہ ابتدا میں وہ شخص اردو کا استاد نہیں مانا جا سکتا تھا جو پنجابی میں نہ کہہ سکتا ہو تو اس قدر ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ قدیم اساتذۂ اہلِ زبان کا جو کلام مہیا ہو سکتا ہے اس میں تھوڑا بہت پنجابی کلام فقط ضرور ہے۔

مرزا صاحب ایک پنجابی نظم کو اس طرح شروع کرتے ہیں :-

"پنی جو سودا دے کی یہ گل کہ قدوی جس کول جاندا ہے"

اس کے علاوہ ایک سارے کا سارا مرثیہ آپ نے پنجابی میں تصنیف فرمایا جس کا بند یوں شروع ہوتا ہے :-

" کوکدی زینب پٹ کے سرنوں سادے جند کھپاواں
تجھ جیہا اک پیر گنواں کر کس نوں مکھ دکھاواں "

حضرت بہادر شاہ نے بہت کچھ پنجابی زبان میں کہا تھا چونکہ اس وقت تک اعلیٰ شاعر وہی سمجھا جاتا تھا جو پنجابی میں بھی شعر کہہ سکتا

www.taemeernews.com

ہو۔ اور ادبی قواعد شاہ وگدا سب پر یکساں حاوی ہوتے ہیں۔ دواوین مروجہ میں دو نظمیں دیوان چہارم میں ملتی ہیں اور ایک دیوان سوم میں۔ یہاں ایک اور امر قابلِ اظہار ہے۔ مولوی سید احمد صاحب دہلوی نے ایک جگہ یہ دعوےٰ کیا ہے کہ اُردو شاہی زبان تھی۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر اردو شاہی زبان اس اعتبار سے تھی کہ اُسے ایک بادشاہ یا کئی شاہانِ دہلی نے نجی ضروریات میں استعمال کیا یا شاہی دفاتر کی زبان تو وہ کبھی نہیں ہوئی) تو یہ فخر پنجابی کو بھی حاصل ہے جیسا کہ شہادت متذکرہ بالا سے واضح ہے۔

علاوہ ازیں بے شمار الفاظ پنجابی زبان کے اس وقت تک اُردو میں جوں کے توں مروج ہیں جبکہ برج بھاشا کا شاید ایک لفظ بھی اپنی اصلی حیثیت میں وہاں نہیں ملے گا۔

خان صاحب مولوی سید احمد صاحب اپنی بسیط لغات اُردو "فرہنگ آصفی" کی جلد چہارم کے اخیر میں ایک نقشہ دیتے ہیں۔ اس میں لغات اُردو کا شمار اس طرح سے کرتے ہیں :۔

ہندی۔ پنجابی ۲۱۶۴۴ لفظ۔ اردو ۱۷۵۰۵ لفظ۔ عربی۔ معرب۔ ۷۵۸۴ لفظ۔
فارسی ۶۰۴۱۔ سنسکرت + ۵۵۴۔ وغیرہ وغیرہ + یہ اعداد صاف بتاتے ہیں کہ
ہندوستانی یا اردو پر پنجابی کتنی حاوی ہے + ہندی کا لفظ جو پنجابی کیساتھ ہے اسے
سورسینی بھاشا سمجھنا چاہئے جس میں کچھ تبدیلی ہو کر پنجابی بنی۔

ان امور واقعی کے رُو سے دلیل کرتے ہوئے ایک منصف مزاج اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اُردو زبان پنجاب میں پیدا ہوئی اور وہاں سے شاہجہان آباد پہنچی۔

اب رہی اردو کی شاعری۔ اس میں بھی فضیلت کی دستار دہلی کے سر نہیں بندھ سکتی۔ بلکہ یہ سہرا بھی پنجاب کے سر ہے۔ یہ تو ہمارے حضرات اہلِ زبان بھی مانتے ہیں کہ ولی گجراتی ان کی اُردو شاعری کا باوا آدم ہے۔ بہرحال بقول ان کے جنہوں نے اردو کو پیدا کیا۔ کمال کی معراج کو پہنچایا ان میں سے کسی سکندر طالع کو یہ نصیب نہ ہوا کہ اسے اُردو کا پہلا شاعر مانا جاتا بلکہ وہ بقول ان کے ایک گجراتی ہے اور اس بزرگ کی زبان وہ ہے جو اُس زمانے میں پنجاب میں بولی جاتی تھی۔ آزاد مرحوم لکھتے تو لکھ گئے کہ ولی کے کلام میں بعض بعض الفاظ دکھنی بھی ہیں مگر ایسا ایک لفظ واحد کا بھی اُنہوں نے نشان نہیں دیا۔ بخلاف اس کے ہم کہتے ہیں کہ ولی کے کلام میں پنجابی لفظ بہت سے ملتے ہیں۔ چنانچہ اس غزل کی ردیف ہی پنجابی ہے ؎

"یہ تل تجھ مکھ کے کعبہ میں مجھے اسود حجر دستا
زنخداں میں ترے مجھ چاہِ زمزم کا اثر دستا"

دستا صاف پنجابی مصدر ہے۔ حقیقت میں ولی خواہ وہ پنجابی گجرات کے رہنے والے ہوں یا دکھنی گجرات کے۔ اُردو کے اوّل شاعر نہ تھے بلکہ ان سے پیشتر کئی شاعر اُردو کے پنجاب میں ہو چکے تھے۔ سرہند کے ناصر علی اور ولی کا معرکہ آپ نے سُنا ہو گا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ناصر علی سرہندی کے سامنے ان کی ہوا اس شاعری میں بندھنی محال ہے تو حسد کی آگ سے بھڑک اُٹھے اور اوچھے ہتھیاروں پر اُتر آئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :۔

www.taemeernews.com

"اُچھل کر جا پڑے جوں مصرع برق
اگر مطلع لکھو ناصر علی کوں"

مگر پنجابی نے وہ مُنہ توڑ جواب دیا کہ حضرت کا حلیہ بگڑ گیا۔

"باعجاز سخن گر اُڑ چلے وہ
ولی ہرگز نہ پہنچے گا علی کوں"

ولی کا دیوان موجود ہے لیکن ناصر علی کا دیوان نہیں ملتا۔ اس سے جو جی چاہو کہہ لو۔ ہم کو ایک بہت معتبر بزرگ کی زبانی معلوم ہوا کہ ولی ہندوستانی میں ٹوٹے پھوٹے شعر ضرور کہہ لیا کرتے تھے لیکن یہ دیوان ان کا کہا ہوا نہیں بلکہ ناصر علی سرہندی کا ہے۔ ولی نے چند شہدوں کے ذریعہ سے ناصر علی کا دیوان اُڑوا لیا اور خود مالک بن بیٹھے۔

ایک صاحب کو میں نے ولی کا دیوان معروف دکھایا وہ نہایت تعجب سے کہنے لگے "تم اسے ایک دکنی کی چار سو برس کی زبان بتاتے ہو۔ میں نہ مانوں گا جالندھر میں ایک معزز اور معمر رئیس ہیں میاں باگے خاں۔ وہ یہی زبان بولتے ہیں جو ولی کے ہاں منظوم ہے اور وہ کبھی ستلج کے پار تک نہیں گئے"۔ یہ مزید شہادت ہے اس امر کی کہ ابتدائی اردو شاعری کی زبان پنجابی تھی۔ الغرض کوئی صحیح دماغ اور بے تعصب آدمی اس کے تسلیم کرنے میں تامل نہیں کر سکتا کہ اُردو پنجاب میں پیدا ہوئی اور ابتدائی شاعر اس زبان کے پنجابی تھے۔

اب اُردو کے مرکز کا سوال آتا ہے۔ آؤ دیکھیں آیا دہلی اردو کا مُسلّمہ مرکز ہے یا نہیں 'چہار درویش'، 'فسانۂ عجائب' اور 'سرورِ سخن' سے جو بحث پیدا ہوئی اس کا بیّن ثبوت ہے کہ اُس زمانہ میں دہلی اُردو دنیا کا مرکز نہ تھی۔ آزاد خود لکھ گئے ہیں کہ لکھنؤ دہلی کی قید سے آزاد ہو گیا۔ یہی حال آگرہ اور عظیم آباد کا ہے۔ آگرہ ذرا تامل کے بعد اس گھوڑ دوڑ میں شریک ہوا مگر اس نے دہلی اور لکھنؤ دونوں کو دھتا بتائی۔ اور لکھنؤ والے تو کھلے بندوں کہتے ہیں کہ دہلی والے اُردو کیا جانیں۔ ابتدا میں قحط الرجال کی وجہ سے ضرور وہ خواہ مخواہ مرد آدمی بن بیٹھے تھے لیکن لکھنؤ نے دہلی کو پیچھے ہٹا دیا:

"دعوے زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے
اظہار بوئے مشک غزالوں کے سامنے"

دہلی والے یہ فرماتے ہیں:-

"اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے"

نسیم دہلوی نے کہا:-

"نسیم دہلوی ہم موجد باب فصاحت ہیں
کوئی اردو کو کیا سمجھے گا جیسا ہم سمجھتے ہیں"

www.taemeernews.com

داغ مرحوم کے اُسی دیوان میں ایک شعر یہ واقع ہوا ہے :-

"اُف رے جلوہ کہ نہیں اور نگہ شوق میں ہے
بن بے پردہ کہ وہ ہے اور دلِ حیراں میں نہیں"

واقعی اس بن بے والی زبان کو آپ ہی جانتے او سمجھتے ہیں۔ ہم کو اس سے خدا دُور ہی رکھے۔ ہم یہ اصول فلسفہ کا پیش کرتے ہیں کہ ایک امر کے نفی و اثبات کی کوشش یعنی اس پر بحث جاری رہنا اِس کا قطعی ثبوت ہے کہ وہ امر مسلّمہ اور مصدقہ نہیں۔ اہلِ زبان ذرا غور سے دیکھیں کہ جو مرکز اُردو جو مولوی سید احمد صاحب دہلوی نے ۱۹۱۱ء میں لکھا اور شائع کیا ہے۔ کیا دنیا کو اس نتیجہ پر نہیں پہنچاتا کہ اردو کا مرکز کم سے کم اب سے سات سال قبل معرضِ بحث میں تھا۔ ہاں اس سات سال کی قلیل مدت میں جمنا یا گومتی کے کنارں پر کوئی تازہ وحی نازل ہوئی ہو تو دوسری بات ہے ورنہ یہ کہنا سراسر صداقت پر مبنی ہے کہ اِس وقت تک اہلِ زبان اس کا تصفیہ نہ فرما سکے کہ اُردو کا مرکز کہاں ہے۔ ہمارے خیال میں بیربر کی چال چلتے تو بہتر ہوتا۔ روایت ہے کہ دربار اکبری میں ایک دفعہ یہ سوال زیرِ بحث ہوا کہ زمین کا مرکز کہاں ہے لوگوں نے اٹکل پچو باتیں بنائیں آخر بیربر سے پوچھا گیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ بس یہی مرکز سطح زمین کا ہے جہاں ہم اس وقت بیٹھے ہیں۔ ہر سمت کو پیمائش کرتے چلے جاؤ یکساں فاصلہ حدِ ارض تک پاؤ گے۔ مگر اُس وقت تو یہ فقرہ چل گیا لیکن آج بیسویں صدی میں ایسا فقرہ نہیں چل سکتا کیونکہ ہر مہذب گورنمنٹ کا سروے ڈیپارٹمنٹ موجود ہے۔ المختصر اردو دُنیا اب تک یہ قرار نہ دے سکی کہ اردو کا مرکز کون سا ہے اور نہ دے سکتی تھی کیونکہ دعویداروں کا دعوے بلا ثبوت اور جھوٹا تھا۔ مرکز اُردو کا نہ دہلی تھی نہ لکھنو بلکہ پنجاب۔ اس لئے خلقت جھوٹے ادّعا کو کیسے تسلیم کر لیتی۔

ایک اصول مسلّمہ یہ بھی ہے کہ ٹکسال سے کبھی سکہ قلب نہیں نکلتا۔ سونے، چاندی، تانبے یا نکل کی مقدار ٹکسال میں مقررہ نسبت سے بیش و کم ہرگز نہیں ہوتی ہاں قلب ساز ٹکسال کے باہر بیٹھ کر کھوٹے سکے بناتے ہیں اور انہیں رواج دیتے ہیں۔ یہی حال زبان کی ٹکسال اور زبان کے قلب سازوں کا ہوا۔ چونکہ پنجاب اردو کی ٹکسال تھا لہٰذا پنجاب سے اردو کا سکہ قلب نہیں نکلا بلکہ دہلی لکھنو وغیرہ سے ایسے سکے نکلے۔ ان بڑے قلب سازوں میں میر جعفر زٹلی۔ رنگین۔ جان صاحب چرکین وغیرہ ہیں جن کے تعلق کا شرف پنجاب کو نہیں بلکہ دہلی، لکھنو اور ان کا دم بھرنے والے مقامات کو حاصل ہے۔

"تاریخ شاہد ہے کہ دہلی اور لکھنو جن ناموں پر ہو تڑے کا شور مچاتے ہیں اور معاذ اللہ انہیں انبیاؑ ادبیاؑ کے اسمائے گرامی کے ساتھ نتھی کرتے ہیں وہ اصل میں نہ دہلی کے تھے نہ لکھنو کے۔ میر اور غالب اکبر آبادی تھے۔ انشا عظیم آبادی۔ ناسخ پنجابی تھے۔ اور نسیم لکھنوی کشمیری۔ مصحفی نہ دہلی کے تھے نہ لکھنو کے مادر لکھنو کے اکثر مشاہیر میں فیض آباد اور باندہ وغیرہ سے تعلق رکھنے والے تھے۔ دہلی یا لکھنو نے کوئی بڑا جگت استاد اردو کا پیدا ہی نہیں کیا۔

علاوہ بریں ٹکسال میں یہ بھی ہوتا ہے کہ جگہ جگہ سے اجناس خام وہاں آتی ہیں ٹکسال میں صاف ہوتی ہیں پگھلتی ہیں ڈھلتی ہیں جلا پاتی ہیں اور سکہ رائج الوقت کا چلن حاصل کرتی ہیں یہی حال اُردو کے مصنفین کا پنجاب میں ہوا۔ بہت پُرانے زمانہ کی باتیں قیل وقال کا موجب ہوں گی ہم اس میں چالیس برس کا حال لکھتے ہیں۔ آزاد۔ حالی۔ ادیب۔ ارشد۔ خاور۔ مولوی سید احمد منشی نول کشور

www.taemeernews.com

رائے پیارے لعل - ماسٹر درگا پرشاد - مولوی کریم الدین - منشی ہر سکھ رائے وغیرہ خام دھاتوں کی طرح اسی ٹکسال میں آگئے اور یہاں سے اشرفی - روپیہ - پیسہ وغیرہ بن کر نکلے اگر پنجاب اردو کی ٹکسال نہ ہوتا تو ایسا ہرگز نہ ہوتا - اگر یہ کہا جائے کہ صوبۂ دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے یہ سب لوگ یہاں کھچ آئے تھے تو ہم کہیں گے کہ لکھنؤ اودھ کا - آگرہ اضلاع آئینیس کا اور الہ آباد صوبۂ متحدہ کا دارالحکومت زیادہ تر مدت سے چلے آتے ہیں - اسی طرح رام پور اور حیدر آباد ہمیشہ سے اہل زبان کا ملجا و ماویٰ رہتے آئے ہیں نئی نثر اور نئی نظم کی بنیاد وہاں کیوں نہ پڑ سکی - مگر ایسا ہوتا کیسے - پنجاب اردو کا مولد و منشا تھا اس لئے پنجاب ہی میں اردو کا نیا جنم بھی ہوتا تھا یہ اصحاب جن کے نام نامی ابھی گنائے گئے ہیں ان میں سے اکثر تلف ہو گئے رہتے اگر اس ٹکسال کے تادیے مستفید نہ ہوتے - دہلی - لکھنؤ کی تو یہ بات ہے کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا - لوگ ادھر اُدھر سے بن بنا کر وہاں جاتے اور اس مقام کی عزت بڑھاتے - جس طرح عظیم آباد کے انشا نے قدیم زمانے میں اور تبت کے راسخ نے حال کے گذشتہ زمانے میں دہلی اور لکھنؤ کا ناطقہ بند کر دیا تھا - اسی طرح آجکل اقبال - نیرنگ - حسرت - ناظر اور محروم وغیرہ نے دہلی، لکھنؤ کو پرے بٹھا رکھا ہے - دہلی اور لکھنؤ والے کسی معرکہ میں باہر والوں سے در ہی نہ آسکے - وجہ یہ کہ ان شہروں میں سے کوئی اردو کی ٹکسال نہ تھا - "تو تو" اور "ہی ہی" کے سوا انھیں آتا ہی کیا تھا -

اس اہل زبان طبقہ میں ایک بات یہ بھی ہے کہ کسی باہر والے خاص کر پنجابی کو جہاں بڑھتے دیکھا بس آگ ہی تو لگ جاتی ہے - اور اس کی تنقید جا و بیجا تو کیا تحقیر و تضحیک پر اُتر آتے ہیں - ہم کہتے ہیں کہ لکھنؤ والے ناسخ - آتش - بحر - رشک - صبا - وزیر - قلق - امانت - اسیر - امیر - جلال اور جلیل وغیرہ کے کلام کو تنقید کی چھلنی میں کیوں نہیں چھانتے - اسی طرح دہلی والے ذوق - مومن - غالب - داغ - سالک - مجروح - بیخود - سائل - شاعر اور کیفی وغیرہ کے کلام کو تنقید کی کسوٹی پر کیوں نہیں کستے - مگر وہ ایسا کریں تو کس منہ سے کریں دہلی اور لکھنؤ کے یہ اصحاب جن کے نام اوپر لکھے ہیں اور مشتے انہا کا کلام عیوب شاعری اور نقائص زبان سے بھرا ہوا ہے - جو آدمی شیشہ کے مکان میں رہے اُسے دوسروں کے گھروں پر پتھر پھینکنے نہ چاہئیں - خیر اگر وہ اس فرض میں قاصر رہے تو ہمارا ارادہ ہے کہ آئندہ نمبر سے مشاہیر شعرائے دہلی و لکھنؤ کے کلام پر ریویو کریں گے - اس کے بعد پنجابی شعرا کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالیں گے اور ثابت کریں گے کہ پنجاب کی اردو شاعری دہلی اور لکھنؤ کی اردو شاعری سے افضل اور اعلیٰ ہے -

اہل زبان ناظرین سے ہماری یہ سماجت التجا ہے کہ بصورت اختلاف رائے ثقاہت اور متانت کو ہاتھ سے نہ دیں اور اپنے بزرگوں مثل میر جعفر زٹلی اور جان صاحب کے ترکہ کا صرف نہ فرمائیں - علمی مباحث میں پھکڑ اور فحش گوئی سے کام لینا بعض اہلِ زبان نے اپنا شیوہ بنا لیا ہے - گالی گلوچ اور پھبتی ان کے مناظرہ کے ہتھیار ہیں - ہم بڑی خوشی سے سنیں گے اگر دلیل کے جواب میں دلیل اور واقعہ کے سیے واقعہ پیش کیا جائے -

ہمارے خیال میں دہلی اور لکھنؤ میں مولوی سید احمد مولف فرہنگ آصفیہ سے بڑھ کر اردو زبان کی تحقیق کسی کو حاصل نہیں -

www.taemeernews.com

مگر دیکھنا یہ ہے کہ وہ خود کیسی زبان لکھتے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے شاعری کے میدان میں بھی قدم مارا ہے لیکن وہ شاعر مانے نہیں جاتے۔ اس لئے نثر کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ہم یہاں ان کی تازہ ترین تصنیف محاکمہ مرکز اردو میں سے چند فقرے لے کر اُن پر تنقید کریں گے۔

صفحہ ا۔ "ہر ایک شہر کی بولی اپنے شہر سے ایک مخصوص خصوصیت رکھتی ہے۔" کوئی بتلائے کہ یہ مخصوص خصوصیت کیا جانور ہے۔ کیا عام خصوصیت بھی ہوا کرتی ہے۔ خصوصیت کی یہ صفت غالباً "شب لیلۃ القدر کی رات" کو سوجھی ہوگی۔

صفحہ ۴ ۔ "یہ بات بالاتفاق مانی ہوئی اور تسلیم شدہ ہے۔" اب کوئی پوچھے کہ حضرت "مانی ہوئی" کے ساتھ "تسلیم شدہ" لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ دونوں فقرے بالکل ہم معنی ہیں۔ پھر اس تکرار سے حاصل محض طول کلام یا شاید یہ مطلب ہو کہ ہم اردو لکھتے لکھتے اردو کی فارسی بنا سکتے ہیں۔ غرض اہل زبان کے نکات اہل زبان ہی سمجھ سکتے ہیں۔

صفحہ ۶ ۔ "دہلی شاہجہان آباد کے سوا دوسرا کوئی سا شہر ٹکسال اور مرکز اُردو قرار نہیں پا سکتا۔" اس کی ترکیب نحوی سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ "دہلی شاہجہان آباد" میں کیا تعلق ہے۔ کیونکہ آگے دو لفظ بتوسل حرف عطف استعمال کئے ہیں۔ یعنی "ٹکسال اور مرکز اُردو" اس لئے گمان ہو سکتا ہے کہ دہلی اور شاہجہان آباد دو مختلف شہر ہیں۔ جن میں سے ایک اردو کی ٹکسال ہے اور دوسرا اُردو کا مرکز۔ مگر اس میں مولوی صاحب کا اجتہاد کوئی نہ مانے گا کیونکہ یہ دہلی اور شاہجہان آباد ایک ہی شہر ہے۔ لوگ پرتھی راج کے شہر کو "پرانی دہلی" کہتے ہیں۔ پھر اہلِ زبان سے یہ دریافت کرنا ہے کہ آیا وہ "کوئی سا" کو صحیح مانتے ہیں اور صحیح تسلیم کرتے ہیں (یہ تکرار مولوی صاحب کی ٹھیٹھ ٹکسالی اُردو ہے)

"زبان پہ پورا قابو اور اس کی حرکات و سکنات" ہم نہیں جان سکتے ہیں کہ زبان کی حرکات و سکنات کیا ہوتی ہیں مولوی صاحب یا کوئی اہل زبان فرمائیں۔

صفحہ ۸ ۔ ۹ "اسی طرح لکھنؤ پر بھی مُنہ آیا جاتا ہے۔" یہ فعل مجہول ہے تو فعل لازم سے کیسے بنا۔ اگر "سکن" کا مطلب لیا جائے تو معنی ضبط۔ آخر یہ ہے کیا صیغہ۔ ذرا ترکیب صرفی فرمائیے۔

صفحہ ۱۶ "بڑے بڑے اہل کمالوں کو فراہم کیا۔" ذرا ان اہل کمالوں کو دیکھیے گا۔ بس اور کیا کہا جائے۔ یہ ہے ٹکسالی زبان اور فصاحت۔ جی ہاں دلی کا تحفہ دلی کی زبان اگر وہ تحفہ یہ اور ایسی ہی زبان ہے تو حضرت اسے اپنے اہل زبانوں کے لیے اٹھا رکھئے ہمیں اپنی پنجابی اُردو ہی بھلی۔ جس ترکیب فارسی میں اضافت واقع ہو اس کی جمع ہندی طریق پر نہیں بن سکتی۔ صاحبدل کی جمع صاحبدلوں ٹھیک۔ لیکن اہل دل کی جمع اہل دلوں غلط اور سراسر غلط۔ مگر ان اہل زبانوں کو کون کہے۔ کوئی پنجابی اگر ایسی ہی ٹکسالی جمع لکھ جاتا تو دلی سے لکھنؤ تک ایک قیامت برپا ہو جاتی کہ خون کر دیا۔ زبان کا خون کر دیا۔ خدا ان جاہلوں کو غارت کرے۔ مولوی صاحب یوں تحریر فرماتے "بڑے بڑے اہل کمال فراہم کئے۔ یہ پنجابی اصلاح۔ معاف فرمائیے گا۔

صفحہ ۱۷ "تمام دکن و اہل جوہر کا دل شاد اور اُن کا گھر خوشی و خرمی سے آباد کر دیا۔" جناب یہاں پھر آپ "اہل کمالوں" کی سی زبان لکھ گئے۔ حضرت والا۔ گوش ہوش سے سنئے اور یاد رکھئے کہ واؤ عطف دو فارسی الفاظ کے درمیان ہی مستعمل ہو سکتی ہے یعنی معطوف علیہ اور معطوف دونوں فارسی ہونے چاہئیں یہ نہیں کہ دونوں ہندی یا ایک ہندی اور ایک فارسی۔ مگر جب آپ کے خدائے سخن

www.taemeernews.com

مرزا غالب بقول آپ کے واؤ عاطفہ کی خصوصیت نہ سمجھ سکے تو آپ کا کیا قصور۔

غالب: زبانِ میر اور مرزا کہاں ہے

مگر ہاں پہیلیوں میں خوش بیاں ہے (محاکمہ صفحہ ۹)

یہاں بیساختہ زبان سے نکلتا ہے جو کفر از کعبہ برخیزد۔ یا ہماری رائے میں اس مصرعہ کو اب اس طرح بدل دینا چاہیے۔

"جو نقص از دہلی برخیزد کجا ماند زباندانی"

اس دو تین جزء کے رسالہ میں یہ انگریزی الفاظ ہماری نظر میں آئے۔ سیشن۔ ہیرو۔ گرامر۔ پبلک۔ ٹریڈ لینگویج۔ لیڈروں۔ پارٹی فیلنگ۔ فیل۔ پاس آتیل ممبر۔ شورٹ ہینڈ۔ ناظرین تمکین ذرا غور کیجئے کہ جو شخص زبان اُردو کی ایک اہم ادبی تنقیح پر بحث کر رہا ہو اور اتنے مفرد اور مرکب انگریزی الفاظ بلکہ فقرے بھی بلا تکلیف اور بلا ضرورت صحیح استعمال کر جائے۔ وہ اُردو کا کس درجہ ماہر اور اس کے انشاء پر کتنا قادر ہوگا۔ مگر حضرت یہ "اہلِ زبانوں" اور "اہلِ محاوں" کی زبان ہے۔ ان کو نام رکھنا ثوابِ آخرت سے محروم ہونا ہے۔ قرآن احمدِ پاک کی خاطر سے عربی زبان میں نازل ہوا یا کسی اور وجہ سے لیکن اس اُردو میں جسے آپ دہلی کی زبان اور دہلی کا تحفہ کہتے ہیں ہرگز نہ اُترتا اور اس پر یہ ڈھٹائی کہ فرماتے ہیں:

احمدِ پاک کی خاطر تھی خدا کو منظور

ورنہ قرآن اُترتا بزبانِ دہلی (فغانِ دہلی)

ذرا اس "بزبانِ دہلی" کی ترکیب کی بھی تعریف کیجیے گا۔

اس تنقید کو اب ہم بخوف طوالت ختم کرتے ہیں۔ ورنہ اس رسالہ سے کہیں ضخیم کتاب اس کی اغلاط کی تصحیح میں لکھی جا سکتی ہے۔

اس محاکمہ میں ایک جگہ آیا ہے "ایک زمانہ میں یہی شاہی زبان تھی"۔ یہاں تو مولوی صاحب نے غلط بیانی کی حد کر دی۔ شاہی زبان اس زبان کو کہتے ہیں کہ جس زبان میں سلطنت کا کاروبار چلے۔ حضرت ابوظفر خلد آشیاں کے عہد تک قلعے کے تمام دفتر فارسی میں تھے۔ جو خریطے گورنمنٹ حکام ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام جاتے تھے۔ سب فارسی میں ہوتے تھے۔ غرضکہ تمام پروانے، احکام اور شقے وغیرہ فارسی میں لکھے جاتے تھے۔ ۱۸۳۵ء تک بھی عملدرآمد رہا۔ بلکہ برٹش گورنمنٹ نے بھی اوّل اوّل سرکاری زبان فارسی ہی رکھی اُردو اگر شاہی یا سرکاری زبان بنی تو غدر کے بعد انگریزی گورنمنٹ نے اس کو یہ شرف بخشا۔

ایک امر میں ہم مولوی صاحب کے از حد ممنون ہیں تنقیدی نظر ڈالنے کے لئے خدا جانے کتنی الماریاں دیوانوں اور کلیات کی ٹٹولنی پڑتیں۔ پھر اُن کا انتخاب کرنا ایک جرِ ثقیل تھا۔ اس پر بھی ممکن تھا کہ کوئی یہ کہہ اٹھتا کہ فلاں شعر جس پر آپ معترض ہیں شاعر کے بچپن کے زمانہ کا ہے۔ مگر جناب مولانا نے یہ مشکل حل کر دی۔ آپ کے رسالۂ مذکورہ میں صفحہ ۲ سے صفحہ ۹ تک "اشعار ان لوگوں کے ہیں۔ جنہیں زبان پر پورا پورا قابو اور اس کی حرکات و سکنات پر بدرجہ اتم عبور حاصل ہے"۔ یہ الفاظ خاص مولوی صاحب کے ہیں۔ ہم بہت افسوس سے کہتے ہیں کہ تقریباً یہ تمام اشعار ان لوگوں کے معلوم ہوتے ہیں۔ جنہیں زبان کی صحت سے کوئی سروکار ہی نہ تھا۔ اگر دہلی کا یہی تمغہ ہے تو خدارا اسے پنجاب سے بدر کرو۔ کہیں پنجابیوں کی زبان بھی نہ بگڑ جائے۔ ناظرین گھبرائیں نہیں

www.taemeernews.com

ذرا توجہ سے سنتے جائیں اور طبع سلیم کو کام میں لائیں:

غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں مُنہ سے مجھے بتا کہ یوں

۱۔ مت زنانی بولی ہے۔
۲۔ یوں بےمعنی ہے یعنی غلط معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یوں کے معنی ہیں "اس طرح سے"۔
۳۔ "پوچھتا ہوں" سے شاعر کا کیا مطلب ہے۔ کیا یہ ہے کہ میں دریافت کرتا ہوں کہ آپ کیا بوسہ دیں گے۔ خوب! معشوق کی ملاقات نہ ہوئی دالسرائے کی قانونی کونسل ہوگئی۔ اس شعر کا مطلب یہ ہو سکتا ہے :۔ میں بوسہ کو پوچھتا ہوں تو مجھے منہ سے بتا کہ یوں۔ ناشگفتہ غنچہ کو دُور سے مت دکھا کہ یوں۔ اب ابہام واقع ہوتا ہے کہ پوچھنے والا آیا بوسہ مانگتا ہے۔ یا کہ بوسہ کی ماہیت سے آگاہی چاہتا ہے۔ بہرحال یہ شعر زبان کے اعتبار سے کئی غلطیاں رکھتا ہے اور معنی کے اعتبار سے لغو ہے۔ ہاں ترمیت اور بتادے میں کچھ معنی نکل آئیں تو نکھنؤ جائیے۔ اور کا لکا بندا سے ہدایت لیجئے:

سر بوقتِ ذبح اپنا اُس کے زیرِ پائے ہے
یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

۱۔ "اپنا" معرضِ تنقید میں ہے۔ نمونہ کے طور پر جو شعر پیش کیا جائے اس میں یہ عیب خفیف بھی نہ ہونا چاہیے۔ (۲) مولوی صاحب نے یہ نہ سوچا کہ اگر کسی سادہ دل کو خدانخواستہ یہ شعر پسند ہی آگیا۔ اور اس نے دیوان ذوق اُٹھا کہ اس میں سے یہ غزل نکال کر پڑھی تو وہ کس کا سر پیٹے گا۔ وہاں تو خاقانی ہند علیہ الرحمۃ "جائے ہے" "پائے ہے" کے ساتھ "کھلائے ہے" اور "پہنچائے ہے" کا تصفیہ کرتے ہیں اور اس قسم کا تصفیہ سخت ناجائز ہے۔ اس شعر میں اس کے سوا اور کوئی بات نہیں کہ ذبح۔ اللہ اکبر اور لوٹنے میں رعایت ہے۔ یہ بہت خفیف بات ہے جس پر مبتدیوں کی ہی نظر جاتی ہے۔ مگر یہ شہر قابل زبانوں کا مرکز ہے۔ یہاں اگر کسی کی زبان سے بھولے سے دو مصرعے موزوں ہو جائیں تو ٹکسالئے قلعۂ معلّٰے کی "صفیلوں"[1] پر چڑھ کر اس زور سے واد واد کے نعرے بلند کریں کہ عرش بریں تک گونج اُٹھے۔

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو اِدھر بھی

"پھینکے ہے" "دیکھے ہے" "آئے ہے" "جائے ہے" ایک صدی سے سننے میں آئے ہے کہ متروک ہے مگر خدا جانے کیا بات ہے کہ اہلِ زبانوں نے ابھی تک اس ترکیب کو چھٹی نہیں دی ہم آگے چل کر ثابت کریں گے کہ اہلِ زبان آج تک یہ ترکیبیں استعمال کر رہے ہیں۔ مگر یہاں صرف اتنا ہی کہیں گے کہ جو شعر نمونۃً پیش کئے جائیں وہ تو ایسے سقم سے پاک ہوں۔ ٹکسال کا نمونہ

---

[1] صفیلوں؟ مدیر

www.taemeernews.com

دیکھئے کہ سب سے پہلے چھوٹے سکّے ہی دکھائے جاتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں ڈھٹائی ؎

کیوں دلِ زارِ محبت کا نتیجہ دیکھا
دردِ فرقت کا کوئی پوچھنے والا دیکھا

اس مطلع پر ایطائے جلی[1] کا نقص عاید ہے اور پھر "نتیجہ" (مولوی صاحب نے نہ معلوم کس مصلحت کو مدِّنظر رکھ کر "نتیجا" کے تحت میں "نتیجہ" بھی احتیاطاً لکھ دیا ہے) کو "والا" کے ساتھ قافیہ کرنا بھی کچھ کہتا ہے۔ درد کو کوئی پوچھنے نہیں[2] جاتا بلکہ دردمند یا مریض کو پوچھتے ہیں ؎

کیا کہیں! خاک کہیں! عشوہ گروں نے مارا
جان کر سیدھا سا بیچارہ مسلماں ہم کو

۱۔ مصرعہ اولیٰ میں سخت ذم کا پہلو نکلتا ہے۔ مصرعہ کا مصرعہ پڑھ کر پتہ نہیں چلتا کہ کیا مارا اور جبکہ راوی کو روایت کی توضیح میں انداز تکلف یا گومگو ہے۔ کیونکہ کہتا ہے "کیا کہیں! خاک کہیں!" اس سے سامع کا شبہ تیقن کے درجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ عشوہ گروں نے ضرور ہی بھدی کی ہوگی جو کہنے والا کہہ ہی نہیں سکتا کہ کیا مارا اور اس کا ذہن خواہ مخواہ مکروہ الفاظ کی طرف جاتا ہے کہ شاید یہ مارا ہو۔ وہ مارا ہو۔ اب وہ اسی حیص بیص کو چھوڑ کر دوسرا مصرعہ جو پڑھنا شروع کرتا ہے تو یک نہ شد دو شد کا نعرہ بے تحاشا اس کی زبان سے نکل جاتا ہے۔ "جان کر سیدھا سا" بھی اپنی جگہ پر خوب واقع ہوا ہے۔ آخر کار بعد خرابی بصرہ شعر کے بالکل اخیر میں جا کر کہیں پتہ چلتا ہے کہ عشوہ گروں نے "ہم کو" مارا چلو چھٹی ہوئی۔ جان بچی لاکھوں پائے۔ بارے شاعر کو ہی مارا۔ شہر پر تو کوئی بم نہیں مارا۔ مگر ٹھہریئے یہ آپ کا "مسلماں" بھی بہت ٹیڑھا واقع ہوا ہے۔ بلا اضافت نون کا غنّہ لانا غلط ہے۔ آپ اس کا اعلان کریں۔ آپ فرمائیں گے پھر مصرعہ وزن سے گر جائے گا۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ پھر ایسی ٹٹو کو اصطبل میں ہی رہنے دیا ہوتا۔ آپ اسے گھوڑوں کی نمائش میں لائے ہی کیوں۔ مگر بیچارے کیا کرتے۔ اہل زبانوں کے پاس اور دھرا ہی کیا تھا جسے دکھاتے۔ کانا ٹٹو۔ بدھو نفر۔

رہو گے دل میں آنکھوں سے نہاں ہو
بھلا؟ بچ کر! رہو جاتے کہاں ہو

شعر کا مضمون شاعر کے ذہن میں یہ ہوگا۔ دیکھیں تو آنکھوں سے نہاں ہو کر دل میں کیسے رہو گے۔ تم ہماری آنکھوں سے بچ کر نہیں رہ سکتے۔ کہاں جاتے ہو ذرا ٹھہرو اور آزماؤ۔ مگر چونکہ شاعر کو زبان پہ قدرت نہ تھی۔ وہ نظم پر حاوی نہ تھا۔ اور آپ یاد رکھئے کہ اہل زبانوں میں یہ عیوب نہیں ہوا کرتے۔ لہٰذا یہ اٹرا ٹرا شعر کہہ دیا۔ اس شعر میں چند موٹے نقص ہیں۔ اوّل تو یہ کہ ہو ہو کر کی جگہ آیا ہے۔ جو مدت سے خلاف محاورہ قرار دیا جا چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ بھلا بالکل بھرتی ہے۔ محض برائے وزن شعر۔ مولوی صاحب نے علامت استفہام اور علامت ندائیہ کا انگریزی استعمال بھی کیا مگر مطلب خبط تھا خبط ہی رہا۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اس بھلا میں کیا استفہام

---

[1] ایطائے جلی تو درکنار یہاں تو خفی بھی نہیں۔ مدیر

[2] درد کا استفسار کیا کوئی ادبی گناہ ہے؟ مدیر

www.taemeernews.com

ہے۔ اب زیادہ کیا لکھیں ابھی اور بہت سے شعر رہتے ہیں ؎

پیو بھی پلاؤ بھی ! اس کا مزا ہے
یہ مینا رکھا ہے یہ ساغر دھرا ہے

"پلاؤ" کی واؤ کی ہمزہ بےتکے پلاؤ کی طرح چلا رہی ہے۔ "رکھا" بلا تشدید "ک" آیا ہے۔ رکھا چاہئے تھا دوسرے مصرعہ میں دو مختلف فعل معنی کی خوبی کو دوبالا نہیں کرتے۔ بلکہ گھٹا دیتے ہیں۔ ایسے موقعہ پر تکرار ہی مزا دیتی ہے۔ اس شعر کو اس طرح بہتر بنا سکتے ہیں ؎

پیو اور پلاؤ اسی میں مزا ہے   یہ مینا دھرا ہے یہ ساغر دھرا ہے

مزا ہے یہی بات میں بات نکلے
ادا میں ادا جب نہ ہو پھر تو کیا ہے

"پھر" کا ہیر پھیر ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ "تو پھر" ہوتا تو ٹھیک تھا۔ حرف جزا شرط کے بعد ہی آجانا چاہیے :

میخانہ میں کیا لطف ہے کیا مانگ ہے ساقی
آواز چلی آتی ہے لا اور پلا اور

"اور" یہ مانگ بھی خوب نکالی کسی نے شاہد رعنائے سخن کا حسن دوبالا ہو گیا۔ یہ مصرعہ یوں کہنا چاہیے تھا ؏
"میخانہ میں کیا بھیڑ ہے کیا شور ہے ساقی"

؎ میں بھی تو آزمائش مہر و وفا کروں   میرا تو امتحان کئی بار ہو چکا

معشوق نے مہر و وفا کا دعوےٰ ہی کب کیا تھا کہ آپ کمر باندھ کر ان صفات عاشقانہ کی آزمائش پر تیار ہو گئے نفیس مذاق والے ضرور کہیں گے کہ "یہ تو تو" کھلتی ہے۔

؎ کبھی کی ہو چکی جاں تک بھی نذر جانستاں طالب   دھرا ہے خاک یاں لینے جو کچھ اب موت آتی ہے

اس شعر میں کئی نقص واقع ہوئے ہیں۔ اول تو "جاں" میں اعلان نون چاہئے۔ پھر یہ کہ محض "جانستاں" معشوق کی جگہ نہیں آسکتا۔ اسے بطور صفت استعمال کر سکتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر "یہاں" کی جگہ "یاں" باندھا ہے۔ جو مدت سے متروک ہے۔ "کچھ" بھی واہیات ہے۔ اول مصرعہ میں "بھی" بھی بھرتی ہے محض بھرتی۔ جب "جان تک" کہہ چکے جو دنیا کا خاتمہ کر چکے۔ "بھی" "تک" کے معنے کی کچھ تذلیل ہی کرتا ہے۔ نہ کہ تفصیل۔ اس کی جگہ "تو" ہوتا تو مضائقہ نہ تھا۔ غرض کہ یہ شعر بالکل لچر ہے۔ مگر ہاں ان زباں کا کی زبان کا پورا نمونہ ہے۔

؎ ان کی سیدھی سیدھی باتیں لیں چبھتی ہیں بہت   ایسا ویسا تم نہ سمجھو اس کو بیدل دور ہے

دوسری "سیدھی" کی اخیر کی ی تقطیع کے اثر گرنے کو دولتی لگا کر سیدھی تھان کو بھاگتی ہے۔

اب سانس کے لینے کی بھی طاقت نہیں باقی
بیدل کا برا حال ہے اللہ بچائے

www.taemeernews.com

اول مصرعہ میں سانس کے بعد "کے" غلط اور غیر فصیح ہے۔

؎ بھلا میں اس کے چکلے میں کہیں آنے کے قابل ہوں
اگر اغیار بدڈھب ہیں تو یاروں میں بھی بیدل ہوں

اول مصرعہ میں ذم کا پہلو ہے۔ "چکلے" نے بیطرح "ہیں ہیں" کی ہانک لگائی ہے۔ لفظ "قابل" کے وہ معنی نہیں جو شاعر اسے پہنانا چاہتا ہے۔ محض بیدل کے ساتھ قافیہ پیمائی ہے۔ دوسرے مصرعے میں بدڈھب اور بیدل کا جوڑ میل۔ اسے صل وجل یہ شعر بالکل عامیانہ اور بازاری زبان میں ہے۔ صاحبو ذرا اس "یاروں" کو بھی یاد رکھنا!

؎ سچ پوچھئے تو ملنا ممکن نہیں جہاں میں
دانا بھی آدمی سا نادان بھی بشر سا

دونوں جگہ یا آدمی ہی لاؤ یا بشر۔ یہ تنوع معنی کی خوبی کا خون کرتا ہے

؎ میکدہ دُور ہے کتنی اے شیخ لو آؤ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

اس شعر کی اول تو تقطیع ملاحظہ ہو اور پھر مصرعہ اولی پر توجہ ہو۔ پڑھنے والے کو یہ شبہ ہوتا ہے۔ کہ شاعر شیخ سے دریافت کرتا ہے کہ میکدہ کتنی دُور ہے۔ مہربانی سے بتا دیجئے۔ یہ دھوکہ "کتنی" کے استعمال نے دیا۔ بولتے یوں ہیں۔ میکدہ ہے ہی کتنی دور۔ چلو آؤ۔ ابھی پی کے چلے آتے ہیں" لو آؤ" بھی خلاف محاورہ ہے۔

؎ عاشق کی دلداری دلبر کیا ہی خدارا کرتے ہو
ان نیچی نیچی نظروں سے تم کام ہمارا کرتے ہو

مانا یہ شعر آجکل کا نہیں۔ مگر کیا شاعر نے دیوان حافظ بھی نہیں پڑھا تھا۔ اگر صرف و نحو فارسی سے بے بہرہ تھا تو یہ تصرف بیجا چہ معنی دارد۔ لفظ خدارا حرف ندا و ندبہ کے طور پر آتا ہے یضمن کلام میں مثل توابع نہیں آتا۔ خواجہ حافظ فرماتے ہیں ع

دل میرود ز دستم صاحب دلاں خدارا

؎ ارادہ گدگدی کا اور قصد بوسہ یاں دل میں بھلا تم بیٹھے بیٹھے بے تکلف کیوں سنبھل بیٹھے

"یاں" متروک کم سے کم نمونہ کے شعر میں نہیں آنا چاہیئے۔ بے تکلف کے معنے گم بھلا حشو قبیح آگے پڑا ہے۔

؎ بت ہی بن کر آن بیٹھیں گے بُلا لو تم ہمیں
کاٹ لینا تُم زباں گر لب ہلائیں سامنے

"آن بیٹھیں گے" بُرا تم زبان ہے۔ "کاٹ لینا" میں ذم کا پہلو ہے۔ ہلیں لب اور کاٹی جائے زبان یعنی یہ کہیں۔ کوئی کرے۔ کوئی بھرے۔ "لب ہلائیں" کی جگہ "کچھ بھی بولیں" وغیرہ فعل معتدلانا چاہیئے تھا۔

؎ یاں تلک آکے پھر اُلٹا تمہیں جانا کیا تھا
کیا زمیں ناپنے آئے تھے یہ آنا کیا تھا

www.taemeernews.com

"یاں" اور "تک" دونوں یقیناً متروک ہیں۔ "اُٹھا" کا الف ماقبل تقطیع میں ساقط ہے۔ "زمین" کے نون کا اعلان چاہیے۔

ے یہ کبھی ہوتی نہیں میں تمہیں سمجھنے والا آج　　　لاکھ اب آپ لیا کیجئے انگڑائیاں

"یہ کبھی ہوتی نہیں" مبتذل روزمرہ ہے۔ شتر گربہ کا شدید نقص اس شعر میں واقع ہوا ہے۔ "تمہیں" کے ساتھ "آپ" نظم کیا گیا ہے۔ یہ انداز کلام اہلِ زبانوں کا ہے۔ "اب" بھرتی ہے۔

ڈبا دیا مجھے اس چشمِ تر کو کیا کوسوں

کیوں؟ اسی چشم نے تو دل میں خارِ غم چبھا دیا تھا۔ اب ڈبا دیا تو کیا غضب کر دیا سمجھے آپ؟

ے تو ہم ہی اس جہان سے روپوش ہو چلے　　　تہ کر رکھو اب آپ اس اپنے حجاب کو

"رکھو" میں "ک" بلا تشدید واقع ہوا ہے۔ جو غیر فصیح ہے۔ دوسرے مصرعہ پر شتر گربہ شدت کے ساتھ عاید ہے

ے نہ روکو مجھ کو یہ کہہ کر کہ ہا! سنو تو سہی　　　وصال میں ہے ستم یا دا سنو تو سہی

دوسرے مصرعہ میں "سنو تو سہی" کی جگہ "دیکھو تو سہی" چاہئے تناسب معنی کے اعتبار سے۔ اوّل مصرعہ میں "یہ ہا" بمعنٰی علامت ندا کہاں کی زبان ہے۔

ے دل کھول کے مل چکئے جو میرے خدا ہے
آنکھیں بھی دکھاتے ہو پھر منہ بھی چھپاتے ہو

"مل چکئے" اور "دکھاتے ہو" وغیرہ ایک ہی شخص کی شان میں کہا گیا ہے۔ ڈبل شتر گربہ۔

ے کیا دیکھتا ہے ہاتھ مرا چھوڑ دے طبیب
یاں جان ہی بدن میں نہیں نبض کیا چلے

"یاں" متروک کتنی بار کہلائے گا۔

اب ہم تنقید کے اس سلسلہ کو ختم کرتے ہیں۔ اہلِ نظر سمجھ گئے ہوں گے کہ "اہل زبانوں" کا مذاق زبان کی فصاحت اور صحت کے باب میں کتنا نفیس ہے۔ ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ وہ لوگ اپنی دھن میں ایسے مست پڑے ہوئے ہیں کہ متروکات، ممنوعات، رکاکت، ذم وغیرہ کے معلوم کرنے کی حس ہی ان میں نہیں۔ پھر یہ تو بہت دور ہے کہ وہ اردو کی یا کسی کی اردو کی اصلاح کر سکیں۔ نہ کبھی یہ کام اُن سے بن پڑا۔ اُردو ادب کی تاریخ بتاتی ہے کہ اُردو کا اول مصلح اور وہی سب سے بڑا مصلح ہوا ہے۔ دہلی یا لکھنؤ کا نہ تھا بلکہ آگرہ کا رہنے والا تھا۔ اس بزرگ کا نام سراج الدین علی خاں عرف خان آرزو ہے۔ دِلّی والے اسی پر جامہ میں پھولے نہیں سماتے تو خان آرزو کا انتقال اگرچہ لکھنؤ میں ہوا لیکن وہ بموجب اپنی وصیت کے خاکِ پاکِ دہلی میں دفن کئے گئے۔ اس بزرگ کی نسبت آزاد مرحوم لکھتے ہیں :۔

"خان آرزو کو زبان اُردو پر وہی دعوٰے پہنچتا ہے۔ جو کہ ارسطو کو فلسفہ منطق پر ہے۔ جب تک کہ کل منطقی ارسطو کے عیال کہلائیں گے۔ تب تک اہلِ اُردو خانِ آرزو کے عیال کہلاتے رہیں گے"

www.taemeernews.com

اس سے زیادہ علمی خدمت کا صلہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک دِلّی والا اور وہ بھی کون۔ آزاد مرحوم۔ یہ اقرار اور اقبال کرے۔ اس بزرگ نے نہ صرف یہ کیا کہ اردو کو مزخرفات اور شوقیانہ حیثیت سے نکال کر اُسے واقعی ایک زبان بنایا۔ ترمیم و اصلاح کا دروازہ کھولا اور اُسے ایک مستقل حیثیت دی۔ بلکہ ایسے ایسے شاگرد تربیت کر کے تیار کئے۔ جن پر اہلِ اُردو کو ناز ہے یعنی مرزا جانجاناں مظہر۔ میر محمد تقی میر، میرزا رفیع سودا۔ اور خواجہ میر درد وغیرہ۔ ذوق مرحوم کے حالاتِ زندگی پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ صرف ایک ہی شخص کو اپنا کلام سنایا کرتے تھے اور اُسی کو سخن فہم سمجھتے تھے۔ ان کا نام نثار علی شاہ تھا اور وہ اورنگ آباد کے رہنے والے تھے۔ گویا ساری دِلّی ان کے نزدیک نافہم تھی اور اس باب میں شیخ کی مصلحت اندیشی قابلِ صاد ہے۔ کیونکہ دہلی میں تو کبھی کسی کو صحیح مذاقِ سخن کا مس ہی نہیں ہوا۔

غرض کہ یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچا۔ کہ اُردو کا اوّل اور سب سے بڑا مصلح بھی دہلی کا نہیں تھا۔ پس جسے وہ اپنی زبان کہتے ہیں۔ اس کی اصلاح تک کا فخر بھی ان کو حاصل نہیں۔ نہ وہ اس زبان کے بانی ہیں۔ نمونے جو ان کے کلام کے پیش کئے جاتے ہیں ان کی حقیقت بھی آپ نے دیکھی۔ پھر کیوں کوئی انھیں اُستاد مانے اور ان کے آگے سر جُھکائے۔

مشاہیر شعرائے اہلِ زبان کے کلام و تصانیف پر تنقید کا سلسلہ بھی ملاحظہ ہو:

(۲)

اساتذۂ لکھنؤ

علمِ ریاضی کا اصول مسلمہ ہے کہ ایک دائرہ کا ایک ہی مرکز ہوتا ہے جس طرح دو نقاط کے مابین ایک ہی خطِ مستقیم ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک زبان کا ایک ہی مرکز ہونا چاہیے ع

ایک سے جب دو ہوئے تو لطف یکتائی نہیں

لیکن اُردو کے مرکز کے مبحث میں یکتائی کا سوال اس سے پہلے ہی گم تھا۔ جب کہ اُردو لکھنؤ پہنچی۔ کیونکہ اس کا اصلی مرکز تو پنجاب تھا۔ دہلی صرف بمنزلہ اس چھوٹے دائرے کے تھی۔ جو ایک بڑے دائرے کے اندر کھینچا گیا ہو۔ لہٰذا مرکز وہی پہلا رہا یعنی پنجاب۔ یہ ہم پہلے حصۂ مضمون میں وضاحت کے ساتھ کہہ آئے ہیں اور ثابت کر چکے ہیں کہ اُردو کا مرکز پنجاب ہے نہ کہ دہلی۔ جب دہلی اُردو کا مرکز نہیں تو لکھنؤ کیسے ہو سکتا ہے۔

بایں ہمہ اس کے تسلیم کرنے میں کسے تامل ہوگا۔ کہ لکھنؤ میں ایک قسم کی اُردو مدت سے جاری ہے اور وہاں اس زبان کے لکھنے پڑھنے والے ایک عرصہ سے ہوتے چلے آئے ہیں۔ اُن کو اُردو کس نے سکھائی۔ وہ کیا زبان تھی اور انہوں نے اس زبان سے کیا بنایا یا بگاڑا۔ اس بحث سے اس جگہ درگزر کیا جاتا ہے۔ غرض کہ لکھنؤ کی زبان اُردو اور ادب کی ادبی حیثیت سے خواہ کچھ ہی منزلت ہو اور اہلِ لکھنؤ کی زبان "پوربی اُردو" کے امتیازی نام کی مستحق یا مستوجب ہی کیوں نہ ہو۔ اس مضمون میں مجمل طور پر اس سے بحث کی جائے گی کہ "پوربی اردو" کے اوّل طبقے کے دو شاعروں کی نسبت اصلاحِ سخن اور اُستادی کا جو دعوےٰ کیا جاتا ہے۔ وہ سراسر لغو اور بے بنیاد ہے۔ اس کے بعد اُن کے یعنی

www.taemeernews.com

خواجہ آتش اور شیخ ناسخ کے کلام پر تفصیل کے ساتھ تنقیدی نظر ڈالی جائے گی۔

یہ کہنا صحیح ہے کہ اُردو جو پنجاب سے دہلی میں آکر بگڑ گئی تھی۔ اب وہاں سے لکھنؤ جا کر بگڑ گئی ہے جسے کہتے ہیں تگڑنا یعنی تگڑ گئی۔

آزاد مرحوم آبِ حیات میں دبی زبان سے فرماتے ہیں :-

"اب (لکھنؤ والے) جو چاہیں سو کہیں۔ ہم نہیں روک سکتے۔ چنانچہ شیخ صاحب (ناسخ) فرماتے ہیں :

شہسواری کا جو اس چاند کے ٹکڑے کو ہو شوق — چاندنی نام ہے شبدیز کی اندھیاری کا"

واللہ شبدیز کی شبِ یلدا میں سے خوب اندھیاری نکالی۔ مگر اصل میں اس لفظی رعایت اور بداعت کا سہرا شیخ صاحب کے سائیس گنگا دین کے سر ہے جس سے انہوں نے یہ لفظ سیکھا تھا۔ شیخ صاحب پر بعینہٖ یہ مثل صادق آتی ہے۔ اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔ زبان کی اصلاح کے باب میں جو کسر آپ نے باقی چھوڑی تھی۔ وہ آپ کے شاگردوں نے پوری کر دی۔ بیچارہ منیر ایسی مضحکہ انگیز تشبیہوں اور مراعاتِ لفظی کے لئے مفت بدنام ہے۔ جبکہ قدمائے لکھنؤ میں سے کوئی ایسے مبتذل مضامین سے نہیں بچا۔ مشتے نمونہ از خروارے :

چھترا چلا فاک پہ بت خانہ جتنگ کا — دوڑا ہے نیل گاؤ پہ کتا لفنگ کا
بدل لوں موسم شادی سے میں موسم غم کا — بناؤں گوکھرو گوٹا اگر پاؤں محرم کا
کشتۂ چشم کی تربت کا چرے گر سبزہ — پیٹ سے بکری کے ہو بچۂ آہو پیدا
مرغِ دل کو توڑے گی بلی ترے دروازہ کی — رختِ تن کو کترے گا چوہا تمہاری ناک کا
طفلِ گاذر کے عشق میں آخر — جان سے اپنی ہاتھ دھو بیٹھے
اس قدر لاغر ہوئے ہیں ہم خیالِ زلف میں — اب کاری کو ہماری ایک جوں ڈکار ہے
بالیاں اُس نے زمرد کی پڑھائیں وقتِ خواب — کان کے پتے بنے ہیں سبزۂ بیگانہ آج
شادی کروں عروسِ مضامین تو ڈر سے — نکلے برات کو جۂ بین السطور سے

شمس ولی اللہ۔ ولی

معشوق کو ضرر نہیں عاشق کی آہ سے — بجھتا نہیں ہے بادِ صبا سے چراغِ گل

شاہ مبارک۔ آبرو

سہو کر بولتا تھا مجھ سیتی — بوجھ کر بات کو چھپائے گیا

ل اس بحث میں ہم کنایتہً یا صراحتہً اِن شعرائے لکھنؤ کو شامل نہیں کرتے جو جدید سکول یا طبقۂ حال سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی جگہ اور شاعروں اور ادیبوں کے ذیل میں ہے۔ جو بلا قید مقام عزت و امتیاز کے مستحق ہیں یہ کون کون اصحاب ہیں۔ اس کا ذکر اپنی جگہ پر آئے گا۔ یہاں و دراں مضامین ہمارا روئے سخن قدمائے لکھنؤ سے ہے۔

www.taemeernews.com

چھوڑتے کب ہیں نقد دل کو صنم — جب یہ کرتے ہیں پیار کی باتیں (محمد شاکر ناجی)

دل کے پرزوں کو بغل بیچ لئے پھرتا ہوں — کچھ علاج ان کا بھی لے شیشہ گراں ہے کہ نہیں (سودا)

اشک آتش و خون آتش و ہر لخت دل آتش — آتش پہ برستی ہے پڑی متصل آتش ″

سب کام نکلتے ہیں فلک تجھ سے و لیکن — میرے دل ناشاد کی امید بر آوے ″

جادو کرتے ہیں اک نگاہ کے بیچ — ہائے رے چشم دلبراں کی ادا (میر)

جب کوندتی ہے بجلی تب جانب گلستان — رکھتی ہے چھیڑ میری خاشاک آشیاں سے ″

لطف سے پوچھتا تھا ہر کوئی — جب تلک لطف کچھ تمہارا تھا ″

اس کے خیال میں ہے کیسے ہی داغ حرف — کرتی ہے بیہودہ جو قلم کی صریر ہو ″

ہوتے ہیں میکدے کے جواں شیخ جی بڑے — پھر درگزر رہے کرتے نہیں گو کہ پیر ہو ″

یہ جو مہنت بیٹھے ہیں رادھا کے کنڈ پر — اوتار بن کے گرتے پریوں کے جھنڈ پر (انشا)

پوچھتے کیا ہو کہ تیرے دل میں کیا ہے مجھ سے پوچھ — اور کیا یاں خاک ہوگی جوش ہے یا اضطراب ″

ہم نے ان اساتذۂ متقدمین (جو طبقۂ اولیں سے لیکر طبقۂ چہارم تک میں جگہ رکھتے ہیں) کے کلام سے صرف ایسے چند اشعار درج کر دیئے ہیں جن میں کاتب۔ مدون دیوان یا آپ اور ہم اصلاح نہیں کر سکتے تھے۔ اگر کوئی ایسا کرتا تو شعر وزن سے گر جاتا ہے یعنی اوپر نشان دیئے ہوئے افعال کو اگر آپ آئے ہے۔ کے طرز پر لائیں تو کلام کلام موزوں نہیں رہے گا۔ مثلاً بجھتے نہیں ہے۔ پڑتے تھا۔ چھوڑیں کب ہیں۔ پھروں ہوں۔ برسے ہے۔ نکلیں ہیں۔ کریں ہیں۔ کوندے ہے۔ پوچھے تھا۔ کرتے ہے۔ نہیں کریں ہیں۔ گریں ہیں۔ پوچھو کیا ہو۔ آپ نے دیکھا کہ ان افعال کے لانے سے شعر کلام موزوں نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا اس میں کسی کا تصرف یا اصلاح و تحریف نہیں۔

لہٰذا یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچا کہ فعل کی اس نئی ترکیب کے موجد یا رواج دینے والے قدمائے لکھنؤ نہیں ہو سکتے۔ گر یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے یعنی ناسخ اور آتش نے اس پرانی ترکیب کو ترک کر کے متروکات قطعی میں داخل کیا۔ سر دست ہم ایک ایک دو دو شعر ان دونوں اصحاب کا یہاں لکھتے ہیں منصف مزاج فیصلہ کر لیں گے کہ یہ دعویٰ بھی کہاں تک حق پر مبنی ہے۔

ناسخ

نشۂ مے ہے جو منہ سے نکل پڑتی ہے زباں — چاہئے ہے دست ساقی سے پئے پیمانہ شمع

آتش

کھچے ہے دور یہ تشبیہہ قد بالا سے — ہوئے ہیں تاڑ سے بھی سرو بے حساب بلند

بھنتا ہے جبکہ عشق کی آتش سے دل مرا — ٹپکے ہیں اشک صورت اشک کباب تیغ

(شیر پنجاب)

www.taemeernews.com

اُردو اَور دیسی زبان

پنڈت برجموہن دتاتریہ

"شکوہ حرفِ تلخ کا یا شورِ بختی کا گلا
ہم جو کچھ کہنے کو ہیں سو بے مزا کہنے کو ہیں"

۱۵ جنوری کے اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ نے اپنے ایک لیڈر سے اس بحث کو چھیڑا ہے کہ کیا اُردو پنجاب کی دیسی زبان ہے اور کہ آیا اسے سرکاری دفاتر۔ عدالتوں وغیرہ میں صوبے کی دیسی زبان رکھا جائے یا نہیں؟ نہ صرف اخباری دُنیا اس معزز روزانہ اخبار کو نیم سرکاری پرچہ قرار دیتی ہے بلکہ عام پبلک اس کو اس شعر کی مصداق گردانتی ہے :۔

"در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ اُستادِ ازل گفت ہماں میگویم"

درحقیقت سول کا اس مضمون کو چھیڑنا بہت کچھ معنی رکھتا ہے اور یہ معنے اَور بھی پیچیدہ اور حاشیہ طلب ہوجاتے ہیں جب ہم ایک ہی وقت میں اس مسئلے کے ساتھ اُن مباحثوں پر غور کرتے ہیں جو ابتدائی سکولوں میں انگریزی اور دیسی زبانوں کی تعلیم کے متعلق آجکل نہایت سرگرمی سے اخبارات میں شائع ہو رہے ہیں۔

جب نیا ایکٹ یونیورسٹی ہائے ہند اعلیٰ کونسل واضع آئین وقوانین کے روبرو تھا تو لوگوں کے دل بہت سے شبہات اور بدگمانیوں کا مخزن تھے اور اب کہا جاتا ہے کہ اُس کے نتائج ظہور پذیر ہونے لگے۔ اس مضمون پر تو پھر کبھی بحث ہوگی کہ آیا تیرہ سال کی عمر تک بچوں کو اپنی دیسی زبان ہی میں تعلیم دی جائے یا کیا۔ بالفعل ہم اس مضمون پر چند خیالات ظاہر کیا چاہتے ہیں جس پر اخبار مذکور نے بحث اُٹھائی ہے۔ اس پر کچھ لکھنے سے پیشتر مخزن کے پڑھنے والوں سے خصوصاً اور عام پبلک سے عموماً میری بادب گذارش ہے کہ اس اہم اور بانتیجہ مسئلہ پر سرسری اور دُوربینی سے غور وفکر کریں نہ کہ ہندو مسلمان یا سکھ پہلو سے۔ جو کہ بدقسمتی سے آجکل خیال کرنے کا وتیرہ ہوگیا ہے۔

اس معاملے پر ایک تاریخی نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ پنجاب۔ ملک کی سرکاری زبان اور پڑھے لکھے آدمیوں کی زبان کے لحاظ سے۔ اپنے ہمسایہ صوبجات سے کسی وقت بھی مختلف نہ تھا۔ جس وقت پنجاب انگریزی قبضے اور تسلط میں آیا اُس وقت شیرِ پنجاب کی سلطنت میں وہی زبان سرکاری اور تعلیم یافتہ آدمیوں کی تھی جو کہ قدیم صوبجات دہلی و آگرہ یا الہ آباد و لکھنؤ وغیرہ یعنی اضلاع آئین اور اودھ کی تھی۔[1] اس دعوے کے اثبات میں وہ عہدنامہ پیش کیا جاتا ہے جو دربار لاہور اور صاحبان انگریز کے

---

[1] مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد کے قبل کا تو ذکر کرنا ہی غیر ضروری ہے جبکہ پنجاب کی قسمتوں کی باگ دربار دہلی کے ہاتھوں میں تھی۔

www.taemeernews.com

مابین ۲۷ نومبر ۱۸۴۲ء کو لکھا گیا تھا :-

"دریں وقت مایان بہ یک دل و یک زبان باتفاق ہم دیگر بعہد و پیمان عہد کردیم و اقرار نمودیم کہ آں چہ بایک دیگر قرار یافتہ کہ سنگھ صاحب شیر سنگھ جی در علاقہ جاگیر خود بمانند و فرزند شنگھ صاحب موصوف پرتاپ سنگھ جی درمیان کونسل تا ہشت ماہ نشستہ شامل دربار باشند..... ۱۶ ماگھ سمت ۱۸۹۹"

اس قرارداد پر راجہ دھیان سنگھ۔ راجہ گلاب سنگھ۔ بھائی رام سنگھ۔ سردار عطر سنگھ سدھاں والہ۔ دیوان دینا ناتھ اور شیخ غلام محی الدین و دیگر صاحبان کے دستخط ثبت ہیں اب یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچا کہ آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط کے وقت پنجاب میں گورنمنٹ اور تعلیم یافتہ آدمیوں کی وہی زبان تھی جو کہ ملکِ ہند کے اس نواح میں دیگر سابقہ مقبوضات کمپنی میں رائج تھی۔ کچھ عرصے کے بعد جس طرح اور صوبجات میں اردو نے فارسی کی جگہ سنبھالی اسی طرح پنجاب میں۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ پنجابیوں نے اردو کو آغوشِ محبت میں لیا یا ٹھکرایا۔ اس امرِ تنقیح کے فیصلے کے لیے ہم اُن قابلِ عزت اصحاب کے نام چھوڑ جائیں گے جو ابتدائی عملداری سرکار انگلشیہ میں دہلی یا مضافات دہلی سے یہاں آئے تھے۔ مثلاً پنڈت موتی لعل صاحب رائے بہادر پیارے لعل صاحب یا شمس العلماء مولانا محمد حسین صاحب آزاد۔ بلکہ ہم ٹھیٹھ پنجابیوں کے نام گنائیں گے۔ جنہوں نے نہ صرف یہ کہ اردو کا تپاک سے استقبال کیا بلکہ اس کو ایسا بنا دیا جیسی کہ وہ آج ہے۔ پادری رجب علی۔ منشی گیان چند اور ان کے صاحبزادے۔ دیوان رام جس مصنف تاریخ کپورتھلہ۔ سردار راجیندر سنگھ مصنف تواریخ خالصہ۔ چودھری خوشی محمد۔ منشی محرم علی چشتی۔ قاضی سراج الدین۔ شیخ عبدالقادر۔ پروفیسر محمد اقبال اور ان کے علاوہ اور بھی اصحاب ہیں جنہوں نے اردو کے پائے کو بلندی اور اس کے نثر اور نظم کے میدان کو وسعت بخشی ہے۔ ان کے ساتھ اگر لالہ ہنس راج آنریری پرنسپل ڈی۔ اے۔ وی کالج۔ جو ہمارے صوبے کے بہترین اردو سپیکروں میں ہیں۔ لالہ منشی رام۔ پنڈت لیکھ رام۔ میرزا غلام احمد قادیانی۔ دیوان نریندر ناتھ مترجم کتاب لبرٹی مصنفہ جان سٹوارٹ مل۔ اڈیٹر صاحبان اخبار وکیل امرت سر و پیسہ اخبار وغیرہ کے نام بھی ایزاد کر دیے جائیں تو یہ فہرست تنقیح زیرِ بحث کو اردو کے حق میں ٹھہرانے کو کافی ہوگی۔

الغرض اردو نے یہاں تک قبولِ عام حاصل کیا کہ نہ صرف جپ جی صاحب تشریح کے ساتھ اردو خط میں چھاپا گیا بلکہ خود سری گورو گرنتھ کو اردو خط میں چھاپ کر اردو کی وقعت کو دوبالا کیا گیا۔ یہاں تک اردو نے رواج اور فروغ پایا۔ عام حالت یہ ہے کہ ہر شریف آدمی عام اس سے کہ وہ کس فرقہ و ملت سے ہے اردو میں اظہارِ مطلب کر سکتا ہے اور کرتا ہے جس کا ثبوت مختلف کمیٹیوں کی روئیداد، سوسائٹیوں کی رپورٹیں اور اور ذاتوں کے قومی رسالے۔ برادریوں کے جلسوں کی رپورٹیں (جو بغرض اصلاح مراسمِ شادی و غمی منعقد ہوتے) اخبار خالصہ بہادر کے فائل وغیرہ ہیں۔ اس کے علاوہ ہر پنجابی جو اعلیٰ اور اوسط درجہ سوسائٹی کا ممبر ہے خاصی اردو بول اور سمجھ سکتا ہے۔

مندرجاتِ بالا پر نظر ڈالنے سے واضح ہوگا کہ قدیم الایام سے اردو کی پنجاب میں وہی حیثیت رہی اور ہے جو شمال مغربی ہند کے اور صوبوں میں۔ بلکہ ہم یہاں تک کہنے کو تیار ہیں کہ اور جگہ سے کچھ بڑھ چڑھ کر ہی۔ اگر یہ واقعہ مسلّم ہے کہ پنجابی سوشل، مذہبی اور دیگر امور میں اور صوبجات کی نسبت عملی معروفیت کا زیادہ اظہار کرتے ہیں۔

www.taemeernews.com

فریقِ ثانی کی جانب سے دو عذر قابلِ سماعت پیش کئے جا سکتے ہیں۔ اوّل سکھوں کے متعلق اور دوئم دیہاتی رعایا کے متعلق۔ ان دونوں کے متعلق بالترتیب ذیل یں عرض کیا جاتا ہے۔

تمام سکھ ایک زبان نہیں بولتے۔ خواہ اُن کو "گرو کا سنگھ" کہا جائے یا محض سکھ اور نانک شاہی یا اداسی وغیرہ لقب دیا جائے۔ سری گرو گرنتھ صاحب کا کلمہ پڑھنے والوں کی ایک زبان ہرگز نہیں ہے۔ حضور صاحب اور پٹنہ صاحب تو خارج از سوال ہیں ہی۔ ہم کہتے ہیں کہ خود ماجھ اور مالوے کی زبانیں نہ صرف لہجہ اور تلفظ بلکہ لسانی حیثیت میں مختلف ہیں۔ پھر ان دونوں میں سے ہر ایک پوٹھوہاری سے الگ ہے۔ ماجھ، مالوہ اور پوٹھوہار یہی تین مقام ہیں جہاں گرو کے نام کے لینے والے بڑے جتھوں میں آباد ہیں۔ علاوہ بریں خاص گرنتھ صاحب کی زبان وہ زبان نہیں ہے جو آج کل کے سکھوں کی زبان ہے۔ عام اس سے کہ وہ قسمت لاہور کے باشندے ہوں یا ریاست حیدر آباد دکن کے۔ اگر اس میں کسی کو شبہ ہو تو سری گرنتھ صاحب کو کھول کر پڑھے اور خود مقابلہ کرلے۔

"سا ہی ماس سب جیو تمہارا   تو ہے کھرا پیارا"

"نانک شاعر یوں کہت ہے   سچے پروردگارا"

دیگر

"وارن جائیں ان اک بار   تو سدا سلامت جی نرنکار"

بھلا یہ زبان کیا ہمارے آج کل کے جٹ زمیندار کی زبان ہے؟ یہ ضرور ہے کہ سارے گرنتھ صاحب کی زبان ایک نہیں ہے۔ گرو صاحبان اور بھگت جس جس زمانے میں ہوئے اسی زمانے کی زبان میں انہوں نے تلقین و وعظ کیا لیکن اُن میں سے کسی کی بھی زبان ہماری آجکل کی پنجابی زبان نہیں ہے۔ یہ بتانا ہمارا فرض نہیں ہے کہ اکثر گرو صاحبان مثلاً سری گرو نانک صاحب یا دسویں بادشاہ عربی و فارسی کے اچھے عالم تھے اس لیے اُن کی زبان بہ نسبت حال کی پنجابی کے اُردو کے زیادہ تر قریب ہے اور عربی و فارسی الفاظ اس میں موجود ہیں۔ نظر بحالات موجودہ اگر ایک گرو کے سکھ کا فرض ہے کہ وہ سری گرنتھ صاحب کی تعلیم کی عام اشاعت کرے تو اُسے نہ تو ٹرمپ یا میکالف صاحب کی انگریزی اور نہ اخبار سول ملٹری گزٹ کی پنجابی بخط انگریزی اتنی مدد دے گی جتنی کہ اُردو۔ سکھ خواہ ہندوؤں سے علیحدہ اور متناقض جنس ہوں یا اُن میں سے ایک فرقہ۔ اس میں کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ سکھ جیسے کہ اس وقت ہیں (یعنی ذات کی قیود کے پابند الخ) وہ اس بیسویں صدی میں اُسی صورت میں اپنی قومی و ملتی شخصیت کو بحال رکھ سکتے ہیں۔ جبکہ نو اعتقادوں کو اپنے میں شامل کریں۔ جب ہندو اس نقص کی وجہ سے کہ وہ غیر ہنود کو دائرہ ہنود میں شامل کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ہر قرن میں گھٹ اور کھینچ رہے ہیں۔ تو سکھوں کے محدود فرقے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ ہاں تو یہ نو اعتقاد جہاں تک کہ قیاس و امکان کا دخل ہے ہندوؤں کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے بھی وہی صوبے کی زبان سکھوں کو بحیثیت ایک مذہبی فرقے کے مفید بیٹھ سکتی ہے جو کم سے کم اُن کے اور ہم خیال۔ ہم اعتقاد یا قریب الاعتقاد ہندو فرقوں کی زبان ہو۔

یاد رکھنا چاہیے کہ آجکل پوشاک۔ طرزِ خورد و نوش۔ آدابِ صحبت وغیرہ ارکانِ معاشرت کے ساتھ اُردو بھی آزادی کے میدانوں میں ہاتھ پاؤں نکال رہی ہے۔ کلاسیکل لغزیت۔ بکھاوہ۔ اہلِ زبان کی سند اور دہلی۔ لکھنؤ کی مہرِ قبولیت۔ ان چیزوں کی اب محتاجی

www.taemeernews.com

نہیں رہی۔ ادھر آریہ سماج کی اُردو دیکھئے ادھر انجمن اسلامیہ کی۔ انشا کے ڈھنگ بے شک جدا جدا ہیں۔ مانا کہ مختلف نہیں۔ لیکن ایک دوسرے کی زبان کو سمجھنے کی قدرت سب کو حاصل ہے اور ہم یہ بھی کہنے کو تیار ہیں کہ انشا کی ان ڈھنگوں کی رنگا رنگی ایک قدرتی امر ہے نہ کہ ارادی و مصنوعی۔ اس طرح سے گویا اُدھر بڑے بڑے ملّا نے ہندی اور سنسکرت کے الفاظ اور اِدھر ہندو پنڈت اور بھائی عربی فارسی سیکھ رہے ہیں جبکہ رسم خط ہر ایک کی اُردو ہے۔ زبان روزمرہ گڈمڈ ہو رہی ہے یعنی اور عام ہو رہی ہے۔ کوئی فرنگی محل یا ترا ہے کا سالخوردہ بزرگ چاہے اس نظارے سے وحشت ناک اور مایوس ہو تو ہو لیکن تمام ترقی پسند اشخاص اس لسانی یگانگت اور باہم آمیزی کو بڑی مسرت اور اطمینان کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

سکھوں کے متعلق (جو ہمارے صوبے کا بوجوہات ایک اہم اور مہتم بالشان فرقہ ہے) اس سوال کا خاتمہ ہو چکا اب فریق ثانی کے دوسرے عذر پر غور کرنا ہے یعنی کہ دیہاتی رعایا کی آسانی کے لحاظ سے۔

یہ امر واقعی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر ملک میں خواہ وہ براعظم ایشیا میں واقع ہو یا یورپ میں اور عام اس سے کہ اُس ملک کا ایک مذہب ہو یا ایک سے زیادہ۔ ایک اور ایک سی زبان ہرگز رائج نہیں۔ ہم آئے دن یورپین پروفیسر کالجوں میں بتاتے ہیں کہ انگلستان میں کونٹی (ضلع) کی زبان جدا ہے اور تاکید سے نوٹ کرتے ہیں کہ دیکھو اس بات کے لئے ٹھیٹھ کائنی (لندن کی) انگلش یہ ہے۔ ایمپیریزم کو رکھئے اونچے سے طاق پر۔ ہم کہتے ہیں کہ وہ ضابطے اور قوانین جو لندن کی پارلیمنٹ اجرا کرتی ہے کیا سکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ کی زبان میں ہوتے ہیں؟ اس سے بھی قطع نظر کیجیے کہ ہائی لینڈر اور آئرش لوگ زبان گیلک کا استعمال کرتے ہیں اگر ہم انیسویں صدی کے بڑے حکیم ہربرٹ سپنسر کے الفاظ ایسے بدیہی امر میں قابل وقعت سمجھیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ خاص انگلستان کی بھی وہ زبان نہیں ہے۔ بلکہ حتیٰ کہ آجکل انگریزی بعینہ وہ زبان نہیں ہے۔ جو کہ لندن کی سرکاری زبان ہے۔ جس میں بطور جملہ معترضہ یہاں اس قدر لکھنا کافی ہوگا کہ متروک الاستعمال دقیانوسی انگریزی اور مرحوم لاطینی زبان کا مُباحنہ شامل ہے۔ اس بحث سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچا کہ خود برطانیہ کلاں اور آئرلینڈ میں سرکاری دفاتر اور عدالتوں کی وہ زبان نہیں ہے جو عوام الناس اور کاشتکار کی زبان ہے۔ اب اس بارے میں ایک نظیر ہندوستان سے لی جاتی ہے۔

صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ میں وہاں کے مشہور لفٹنٹ گورنر سر انٹنی میکڈانل نے جب ہندی کا جُزوی استعمال و رواج وہاں کی عدالتوں میں منظور فرمایا تو حجت یہ اٹھائی گئی تھی کہ وہاں کی کثرت رعایا ہندو ہے اور اس لیے اُردو سے نا محرم۔ لہٰذا ہندی میں درخواستیں وغیرہ عدالتوں میں داخل ہو سکیں۔ لیکن اس حکم نے صرف رسم خط پر اثر ڈالا نہ کہ اس زبان پر جو اُس خط میں لکھی جاتی تھی یعنی انشا اُردو ہی کی رہی صرف املا ہندی ہو گئے۔ یہ نہیں ہے کہ بیع بالوفا۔ تخویف مجرمانہ۔ استحصال بالجبر۔ بیت ڈگری و اصلباقی نویس۔ واجب العرض۔ بندوبست۔ مالیانہ۔ خالصہ وغیرہ کی ہندی یا سنسکرت ترجمے استعمال کئے جائیں۔ عملی طور پر اس سے کیا حاصل ہوا۔ اصلی مطلب سمجھنے کے لیے ہندو زمیندار کو اب بھی پہلی جیسی محتاجی بنی رہی۔ وجہ کیا؟ وجہ وہی جو یہاں اُردو کے خلاف بتائی جاتی۔

جو صاحب یہ کہتے ہیں کہ اُردو کے ہونے سے کاشتکار لوگ وکیلوں اور عرائض نویسوں کے ہاتھ میں ہیں وہ عدالت کے احاطوں میں عرائض نویسوں کے چھپروں اور وکیلوں کے دفتروں میں ذرا دو چار دن بیٹھ کر اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور معلوم کریں کہ آجکل کا زمیندار قانونی معاملات

www.taemeernews.com

میں گفتگو کرنے اور اپنے مقدمے کی کیفیت سمجھانے میں کتنا ملکہ اور آسانی رکھتا ہے۔ ان دلائل سے اُردو جیسی کہ اب ہے ان ساٹھ سالوں کی تعلیم و برتاؤ کے بعد زمینداروں کے لیے نہایت آسانی سے قابلِ افہام و تفہیم ہے۔ یہ اندازہ کرنا لوگوں کی خوش فہمی اور جدت آفرینی پر چھوڑا جاتا ہے کہ بجائے اس کے پنجابی زبان بخطِ انگریزی زمیندار کے لئے سمجھنے سمجھانے کے کہاں تک قابل ہو سکے گی۔

اب ایک بات باقی رہی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس وقت یورپین افسر منشیوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ اس سے دو نتائج اخذ ہوتے ہیں کہ عمال متدین نہیں ہیں اور کہ یورپین افسر باوجود "ہندستانی" میں ہائی پروفیشنسی کا ماسٹر سرٹیفکیٹ حاصل کرنے اور انعام کی رقمیں اڑانے کے بھی کودن محض ہی رہتے ہیں۔ امرِ اوّل قابلِ تسلیم نہیں ہے کیونکہ اس سے انتظامِ صوبہ پر بڑا حرف آتا ہے۔ علاوہ بریں وکیل اور دیگر قانونی پیشہ اصحاب جو آجکل اس بہتات سے اور اتنے سستے ہیں کس طرح منشی جی کی چالاکی کو چلنے دے سکتے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ استغاثے کے اُن الفاظ کو کہ "ملزم نے مقتول کو ایک چھری ماری" حاکم عدالت کو یہ سُنا دے کہ ملزم نے مقتول کو ایک چھڑی ماری"۔ اور قتل عمد کی بجائے ضربِ خفیف اور مرگ اتفاقی کا جرم ملزم پر عائد کرائے۔ یہ سب لغو اور واہیات ہے اور پھر ہم کہتے ہیں کہ یورپین افسروں کو کیوں نہ مجبور کیا جائے کہ وہ اپنے آپ کو اس قابل بنائیں کہ مسلِ مقدمہ کو خود اپنی آنکھوں سے پڑھیں۔

مقصد جو بصد مبالغہ کہا جاتا ہے کہ مطلوب ہے وہ نہ تو پنجابی زبان بخطِ انگریزی اور نہ اُردو زبان بخطِ انگریزی سے حاصل ہوگا بلکہ اس سے کہ افسر ذرا تکلیف اُٹھا کر جس ملک کی خدمت میں اپنی زندگی کا بہترین حصہ قربان کرتے ہیں اُس کی زبان سیکھنے کی کوشش کریں۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ یورپین قانونی پیشہ تو دیسی زبان میں وہ قابلیت حاصل کر لیں۔ بلا انتخابات پرافیشنسی پاس کئے کے اور سول سروس کے عالم ممبران جو پہلے سے کئی زبانوں میں قدرت رکھتے ہیں بوڑھے ہو کر بھی تتلاتے اور ہکلاتے ہی رہیں۔ اس کی صرف ایک تدبیر ہے اور وہ یہ کہ اگر ان کی ترقیاتِ درجہ و عہدہ دیسی زبان کی واقفیت و استعداد پر موقوف رکھی جائیں تو ہم کو سینکڑوں یورپین افسر ٹکسالی اُردو کے ایسے ہی ماہر نظر آنے لگیں۔ جیسے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ست جگی زمانے میں فارسی کے جاننے والے تھے۔

صوبجات متحدہ اودھ میں بھی ایک دفعہ یہ سوال اُٹھا تھا کہ وہاں کے دفاتر عدالت میں اُردو بخطِ انگریزی یعنی رومن اُردو استعمال کی جائے مگر عام مخالفت کی وجہ سے وہ تجویز تہ کر کے رکھی گئی۔

اب تک اس امر پر محض لسانی پہلو سے گفتگو کی گئی ہے۔ یہ لوگوں کا اپنا کام ہے کہ وہ جزوی اختلافات ذاتی پسند یا ناپسند۔ خوشامد مطلب پرستی۔ تنگ نظری و تعصباتِ مقامی و ذاتی سے بری ہو کر اطمینان و تامل سے سوچیں اور غور کریں کہ وہ کس طرح اپنے آپس میں اور اپنے دُور دراز کے بھائیوں کے ساتھ۔ بیوپار۔ برتاری۔ اتحاد ہموطنی اور باہم ہمدردی کے تعلقات کو ترقی دے سکتے ہیں۔ ہماری شوربختی جس کا گلہ عنوان میں کیا گیا ہے۔ سمِ قاتل کا حکم رکھے گی۔ اگر ہم اُردو۔ پنجابی۔ ہندی۔ رومن پنجابی یا رومن اُردو کے مسئلے پر بحث کرتے کرتے ایک اور حدِ فاصل اپنے درمیان میں اُٹھالیں۔ کاش یہ مصرع ہمارا چراغِ ہدایت بنے:

مردِ آخر بیں مبارک بندہ ہے

---

www.taemeernews.com

نئی قومی زبان

سید ہاشمی فرید آبادی

اب وقت ہے کہ ہم ایک نئی مخلوط زبان کی تشکیل و تدریج کی سرگزشت سنیں جو فارسی کو ہٹا کر پاکستان و ہند کے مسلمانوں کی روزمرہ بن گئی تھی۔ وہ ہندی الاصل تھی لہٰذا یہاں کے ہندو باشندوں کو قبول کرنے میں تکلف نہ ہو سکتا تھا۔ جدید ہندو قومیت جسے عربی فارسی کے بلیغ و نفیس الفاظ بلکہ مسلمانوں کے جملہ آثار ناگوار گزرنے لگے ہیں، اس وقت تک عالم ظہور میں نہ آئی تھی۔ یہ سوال کہ وہ کون سی ہندی بولی یا بولیاں تھیں، جن پر اسلامی زبانوں کی سب سے پہلے چھاپ لگی، حل کرنا دشوار ہے۔ کون بتائے کہ جب مسلمان پاکستان اور پھر بھارت کے ملکوں میں آئے، تو ان بولیوں کی حالت کیا تھی؟ لغت اور صرف و نحو ایک طرف، ان کے پرانے گیت کہانیاں، پہیلیاں تک صحت کے ساتھ محفوظ نہیں رہیں بہتر ہے کہ ان مسائل کی گرہ کشائی علمائے لسانیات کے ناخنِ تحقیق کے حوالے کی جائے۔ تاریخ اس بارے میں وہیں تک زبان کھول سکتی ہے جہاں تک تحریری روایت، گواہی میں ساتھ چلنے پر تیار ہو۔

اگر نئی زبان مسلمانوں کے پاکستان میں آنے اور بس جانے ہی سے پیدا ہوئی تو اس کی ولادت گاہ یہی دیبل (کراچی) منصورہ (برہمن آباد) اور ملتان کی بستیاں تھیں اور جیسا کہ ہمارے ایک فاضل دوست نے حال میں دعویٰ کیا، اردو کا مولد سندھ قرار پائے گا یہی ملک برعظیم میں پہلا اسلامی مقبوضہ تھا، یہیں عراق و عرب کے آباد کاروں نے سب سے پہلے مستقل سکونت اختیار کی۔ تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت میں مرقوم ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں جغرافیہ نویس اصطخری سندھ آیا تو منصورہ اور اس کے مضافات میں عربی اور سندھی کا رواج تھا۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ خود سندھی کو لسانی تحقیق کرنے والوں نے (مغربی) ہندی کے بیرونی دائرے کے اندر جگہ دی ہے مسلمان فاتحین کا سب سے پہلے اسی مغربی ہندی سے سابقہ پڑا اور ان کی قدیم ترین ادبیات میں ہندی یا ہندوی سے یہی مغربی ہندی اور اس کی دُور دُور تک پھیلی ہوئی شاخیں مراد لی جا سکتی ہیں مسلمانوں کی دوسری مستقرہ، پنجاب کا ملک ہے۔ دہلی کو مرکز بنانے اور شمالی ہند فتح کرنے سے پہلے اُن کی نوآبادیاں انہی پانچ ندیوں کے کنارے بسی تھیں۔ فاضل شیرانی مرحوم کی "پنجاب میں اردو" کی تشکیل کی بدیہی دلیل یہی ہے کہ یہاں کے مسلمان باشندے لامحالہ مقامی زبان بولنے لگے ہوں گے۔ اسی کو عربی فارسی کی آمیزش نے آگے چل کے ریختہ اور اردوئے معلّٰی کے شہ نشین پر لا بٹھایا۔ تاریخ میں پہلا مسلمان جس نے ہندی میں دیوانِ شعر تصنیف کیا، مسعود سعد سلمان (لاہوری) تھا۔ یہ نادر چیز، معدوم ہو گئی۔ صرف تذکرہ باقی ہے۔ پانچویں صدی کے غزنوی مصنف اور شعرا کبھی کبھی کوئی ہندی لفظ لکھ جاتے ہیں لیکن یہاں کی بول میں ایک مختصر سا مکالمہ صاحب سیر الاولیا نے نقل کیا ہے۔ یہ دو تین جملے صحت و قدامت کے اعتبار سے بہت بیش قیمت ٹھہرے سکتے ہیں کہ برابر

www.taemeernews.com

چلتے رہے لکھا ہے کہ جب شیخ فریدالدین گنج شکرؒ کے عزیز مرید شیخ جمال الدین ہانسوی کا انتقال ہوا تو ان کی بیوی یا حرم جو مادرِ مومناں کے عرف سے پکاری جاتی تھیں مرحوم کے بیٹے کو حضرت کی خدمت میں پاک پٹن لائیں۔ شیخ نے خوردسالی کا خیال نہ کیا۔ بزرگانہ شفقت سے باپ کا عصا نے پیری انھیں عطا کر دیا۔ مادرِ مومناں نے عرض کی کہ حضرت "خوجا برہان الدین بالا ہے۔"

شیخ نے جواب دیا "مادرِ مومناں پونوں کا چاند (بھی) بالا ہوتا ہے۔"

صحیح تاریخیں تحریر نہیں۔ لیکن شیخ فریدالدین کی وفات ۶۶۴ھ میں ہوئی۔ ان کی ایک ہندی بیت "جمعاتِ شاہی" میں منقول ہے۔ چند گیت یا قطعات ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی تلاش سے فراہم ہوئے ہیں۔

ساتویں صدی کے آخر یا آٹھویں کی ابتدا میں امیر خسروؒ "ایک زبان دہلوی" کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی گونج کہیں کہیں اکبری عہد تک سنائی دیتی ہے۔ زبان کی حقیقت کو تحریری شواہد کی کوتاہی اور وقت کی دوری نے گنگ کر دیا لیکن ظاہر ہے کہ وہ کوئی ہندی اور مخلوط قسم کی زبان تھی جسے دہلی کے مسلمان استعمال کرتے تھے مگر ناپید ہے ورنہ اس پر "اردو" کا تسمیہ بخوبی صادق آ جاتا۔ وہ گیت پہیلیاں اور "خالق باری" جو امیر سے منسوب ہیں۔ کسوٹی پر کھری نہیں نکلتیں۔ البتہ وہ مصرعے جن میں آدھے مصرعے فارسی، آدھے ہندی آتے ہیں، بہت ممکن ہے کہ اسی خسروِ سخن نے ڈھالے ہوں۔ نکتے کی بات یہ کہ ایسے اشعار میں پنجاب کی بجائے دوآب کی بولی جھلکتی ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ نیا اسلامی مرکز ملتان و لاہور کے اثر سے آزاد ہو کر اپنی نئی ٹکسال بنا رہا ہے۔ فارسی اشعار یا *اعجازِ خسروی* میں جو ہندی جملے مصنف نے جڑے ہیں، وہ بے شبہا ہی کی زرکاری ہے۔

بھارت کے دوسرے ملکوں میں قدم بڑھانے سے پیش تر، زبان کی جستجو ہمیں دوبارہ پاکستان (مغربی) اور گجرات میں لاتی ہے۔ چھٹی، ساتویں صدی ہجری میں سید جلال مخدوم جہانیاںؒ (متوفی ۷۸۵ھ) اور اُن کے بھائی سید راجو قتالؒ سرآمدِ روزگار تھے۔ تغلق تاج داروں کے سر ان کی چوکھٹ پر جھکتے تھے۔ سید جلال دو تین مرتبہ دہلی بھی آئے۔ دوسرے بھائی، یادِ الٰہی میں غرق رہتے تھے۔ فیروز تغلق خود ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے فرمایا: "کا کافر دز چنگا ہے!" بادشاہ نے اسی پرسش کو موجبِ افتخار سمجھا۔ زبان کی تاریخ میں بھی یہ چند لفظ نقش تعویذ بنا کے رکھنے کے قابل ہیں۔

انہی بزرگ کی نسبت برادرِ بزرگ حضرت مخدوم جہانیاں کا یہ قول منقول ہے کہ "تساں راجے۔ اساں خواجے۔"

مخدومؒ کا انتقال ہوا تو ان کے پوتے سید برہان الدین کی تربیت سید راجو قتال نے کی۔ موصوف لڑکپن ہی میں اپنی ننھیال (؟) یعنی بٹوہ (گجرات) چلے آئے تھے اور آئندہ "قطب عالم" کے معظم لقب سے مشہور ہوئے۔ انھی کے فرزند شاہ عالمؒ گزرے ہیں۔ کوئی سو برس تک ان درویشوں نے سلاطینِ گجرات کے دلوں پر حکومت فرمائی۔ دونوں صاحبوں کے کئی اقوال و اشعار مستند تذکروں اور تاریخوں میں آتے ہیں جن کی زبان وہی مخلوط ہندی، سندھی یا پنجابی ہے۔ مگر تلاش کے سلسلے میں سب سے عجیب سراغ یہ ملا کہ سندھ کے دارالحکومت ٹھٹھہ پر محمد تغلق نے فوج کشی کی قضائے الٰہی سے یہیں وفات پائی (۷۵۲ھ) اور اس کے بعد فیروز تغلق کا پہلا حملہ بھی ناکام گیا کہ رسد نہ ملنے سے لشکرِ شاہی کو ہٹ آنا پڑا۔ ہم عصر مورخ لکھتا ہے کہ شاہی

www.taemeernews.com

پسپائی پر ہنسنے والوں نے تالیاں بجائیں اور یہ مثل بنائی کہ "برکت شیخ پتھا - ایک موا ایک نتھا"۔ اُن کی شیخی تو اگلے جملے میں کرکری ہوگئی مگر یہ تک بندی اس بات کی سند رہ گئی کہ آٹھویں صدی کے اہل سندھ میں، وہی دہلی اور دوآب کی مخلوط و مشترک زبان مقبول تھی۔

زبان پنکھ پھیلاتی ہے

سنہ ۷۲۷ھ میں محمد تغلق پورے شہر دہلی کو دکن اٹھا لایا - مکان تھے، بازار، مسجدیں، سرائیں حویلیاں تک اُسی نمونے کی تعمیر کرا دیں۔ تخمیناً دو لاکھ دلی والوں کو دولت آباد بنا دیا - یہ واقعہ جو خیال کی بلند پروازی اور انسانی ہمت کی کرشمہ سازی میں دیو پری کی بجائے کسی مہادیو کا افسانہ معلوم ہوتا ہے، سیاسیات سے بڑھ کر ہندی لسانیات میں ایک نئے دور کا آغاز کرتا ہے۔ اسی انقلاب کی بدولت ہم شیخ فریدالدین گنج شکر کی صاحبزادی بی بی عائشہ کو دولت آباد میں ملتانی بولتے دیکھتے ہیں۔ بیس اکیس برس میں مہاجرین دہلی دکن کی جداگانہ سلطنت بہمنی تیار کرتے ہیں۔ اس کا پائے تخت گلبرگہ اور عام زبان وہی مخلوط ہندی ہے جسے دہلی سے بولتے ہوئے دکن آئے تھے اگرچہ کچھ عرصے میں یہ بھی دہلوی سے "دکنی" ہو جاتی ہے۔ عہد بہمنی کے دو مصنفوں سے اسی زبان کی چند کتابیں منسوب ہیں - ایک عین الدین بیجاپوری صاحب "محقات طبقات ناصری" (متوفی سنہ ۷۹۵ھ) اور دوسرے خواجہ بندہ نواز (متوفی سنہ ۸۲۵ھ) یہ بحث ابھی تاریخ کی عدالت میں زیر غور ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ خواجہ صاحبؒ عام تعلیم و تلقین میں ہندی سے کام لیتے تھے۔ واضح رہے کہ یہ دونوں حضرات حضرت دہلی سے خاصی بڑی عمر میں دکن تشریف لائے تھے۔

گلبرگہ میں جو بیج برگ و بار لایا تھا، اس کی شاخیں اگلی صدی میں بیجاپور و گول کنڈے تک پھیلیں وہاں دکنی جیسی سرسبز ہوئی، اس کا ذکر آگے آتا ہے۔ پہلے شمالی ہند کے بعض آثار پر نظر کیجئے جن کا زمانہ دکن کی "شاہیوں" سے مقدم ہے۔ سیاسی انقلابات کی تباہی اور تلاش و تحقیق کی کوتاہی کے باوجود ہمیں اس نئی مخلوط زبان کے دور دور تک نشان ملتے ہیں - آج بھی اقصائے شرق و جنوب میں اردو کو "نبی جی کی بھاشا" "مسلمانی بولی" یا "ترکوں کی زبان" کہنے والے مل جائیں گے یہ نام حقیقت میں سلاطین مغلیہ سے پہلے کی زبان کی یادگار ہیں جسے مسلمان فاتح بنا رہے تھے اور ممالک ہند کے بعید ترین گوشوں میں لے جا رہے تھے۔ ہم فاضل شیرانی کی محنت کے منت گزار ہیں جنھوں نے عہد خلجی کے "فرہنگ نامہ" مولانا فخرالدین غزنوی سے لیکر نویں صدی تک کے کئی لغت نویسوں کے "ہندی" مرادفات جمع کئے۔ یہ کسی مقامی بولی کے نہیں، بلکہ مسلمانوں کی اسی مشترک ہندی کے الفاظ ہیں جو "پنجاب، بنگالہ، گجرات اور ہندوستان میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی" اور اس کی بڑی دلیل یہ ہے کہ ان کتابوں کے مسلمان مصنف مختلف اقطاع ہند میں رہ کر یہ لغات و فرہنگ تالیف کر رہے تھے۔ ان میں سب سے مفید شرف نامہ منیری کو ماننا چاہیے جسے نویں صدی میں ایک بنگالی فاضل، ابراہیم قوام فاروقی نے تالیف کیا اور کئی سابقہ ماخذوں کے علاوہ ہم عصر بنگالی ادیبوں سے مدد لی۔ انہی زبان دانوں میں ملک الشعرائے بنگالہ امیر فخرالدین فتح خاں کا نام تحریر ہے۔ لغت میں فارسی ترکی الفاظ کا

www.taemeernews.com

ہندی ترجمہ دیا گیا ہے اور ان میں :

پالک ۔ سوکن ۔ پلاس ۔ ممولا ۔ لہسوڑہ ۔ چونہ ۔ مُنگ (مونگ) تھال ۔
بیلن ۔ راکھ ۔ متسا ۔ السی وغیرہ وغیرہ

بیسیوں لفظ آج بھی فصحائے اُردو کا روزمرہ ہیں ۔

نویں صدی ہجری کا بڑا مشہور صوفی شاعر کبیر گزرا ہے ۔ وہ ان پڑھ اور غالباً نومسلم جلاہہ تھا کہ اسلام کی نسبت ہندوانی عقائد و رسوم سے زیادہ واقفیت رکھتا ہے ۔ صلح کل اور وسیع مشرب ہونے کی وجہ سے ہندوؤں نے اسے اپنا مصلح اور بھگت مانا۔ ممکن ہے قبول عام کا ایک سبب کبیر کی زبان ہو جو ایسی میٹھی، عام فہم، پُرتاثیر ہے کہ ہندو مسلمان سب کے دل میں گھر کر لیتی ہے ۔ افسوس ہے شاعر کے سوانح کی طرح کلام بھی کسی قدر مشکوک ہو گیا ورنہ ایسے دوہے کہ ؎

۱۔ کبیر سر پر سر اسے ہے کیا سووے سکھ چین
سانس نگارا کوچ کا باجت ہے دن رین

۲۔ ماٹی کہے کمہار کو تو کیا روندے موہے
ایک دن ایسا ہووے گا میں روندوں گی توہے

بارھویں صدی کے کسی نظیر اکبرآبادی کے گیتوں سے زیادہ تفاوت نہیں رکھتے ۔

شبہے کو تقویت اس لیے ہوتی ہے کہ وہ آپ ہی ہیں کبیر کے بعد کے مسلمان شعرا (قطبن، جائسی، شیخ عبدالقدوس گنگوہی وغیرہ) کا کلام جو محفوظ رہا، ایسی مشکل اور خالص ہندی میں منقول ہے کہ آج کل ہندی داں بھی شاید آسانی سے نہیں سمجھ سکتے ۔

اسی صدی کے ایک اور صوفی شاعر بہاء الدین باجن (متوفی ۹۱۲ھ) کو بھی شیرانی مرحوم ہی قدیم اُردو کی محفل میں لائے ہیں ۔ یہ برہان پور کے رہنے والے تھے مگر منازل سلوک گجرات میں آکر طے کیں ۔ فارسی کے ساتھ بہت سے ہندی دوہے صوفیانہ رنگ میں لکھے ہیں ۔ خاصی صاف، کبیر سے ملتی جلتی زبان ہے ۔ مگر ان اشعار سے بھی زیادہ کام کی ایک بات یہ لکھ گئے کہ اپنی ہندی کو " دہلوی زبان" سے موسوم و مخصوص کیا اور امیر خسروؒ کے قول کی جو اوپر نقل ہوا ایک قوی شہادت فراہم کر دی ۔

باجن سے کچھ بعد کے چند اور گجراتی صوفیوں کا ہندی یا مخلوط گجراتی کلام دست یاب ہوا ہے ۔ ان میں سب سے خوب خوب محمد چشتی کی مثنوی "خوب ترنگ" (تالیف ۹۸۶ھ) ہے ۔ منظوم دیباچے کے آغاز ہی میں مصنف اشارہ کرتا ہے کہ شاید لوگ اس کلام (ہندی) کو سننا پسند نہ کریں گے ؎

خوب کہے گا خوب ترنگ
سنتیں کچھ نہ کیجو ننگ!

دسویں صدی ہجری کے آتے آتے، جبکہ دہلی میں لودھی پٹھان حکمران ہیں، ہندی زبان کا رواج بڑھتا چلا جاتا ہے ۔ بعض مذہبی اور طبی کتابیں، اگرچہ فارسی میں لکھی گئیں کثرت سے ہندی مرادفات کا استعمال کرتی ہیں تاکہ ناظرین کو سمجھنے میں آسانی ہو ۔

www.taemeernews.com

"اخبار الاخیار" اور "منتخب التواریخ" میں اس عہد کے کئی علمائے صوفیہ کا تذکرہ ملے گا جو ہندی زبان میں تصوف کے نکتے کھولتے تھے۔ طبقۂ اعلیٰ سے فارسی کا چلن اٹھ جانے کی ایک عجیب شہادت بابر نامے میں مرقوم ہے کہ جب دولت خاں لودھی کی شہ سے بابر نے پنجاب پر لشکر کشی کی (۹۳۰ھ) اور پھر یہ پٹھان امیر پشیمان ہو کر بابر سے منحرف ہوا تو اس کا ایک عزیز قلعہ ملوت (وسط پنجاب) میں گرفتار ہو کر بابر کے سامنے لایا گیا بابر نے عہد شکنی اور بے وفائی پر زجر و توبیخ کی۔ دیر تک سوال جواب ہوتے رہے۔ بابر لکھتا ہے کہ یہ مکالمہ ایک "ہندوستانی ترجمان" کے ذریعے ہوا ظاہر ہے کہ لودھی امیر فارسی زبان سے بالکل ناآشنا تھا۔[1]

بابر کی فتح کی ایک دلچسپ لسانی یادگار، یہ ہندی قطعۂ تاریخ ہے جو فاتح کو پڑھ کر سنایا گیا تھا:

"نو سے اوپر تھا بتیسا (۹۳۲ھ) پانی پت میں بھارت دیسا
اٹھیں رجب، سکروار بابر جیتا، ابراہیم ہار آ"[2]

جدید اردو کا ظہور

اردو کے اجزائے اعظم آج بھی ہندی، عربی، فارسی الفاظ ہیں۔ یہ امتزاج مسلمانوں کے پاکستان میں آتے ہی شروع ہو گیا تھا اور جب اس اختلاط پر یہ ہندی کو عربی نسخ (اور پھر فارسی نستعلیق) میں لکھنے لگے تو اصولاً اردو معرض وجود میں آگئی اگرچہ زمانہ دراز تک وہ اسے ہندی، ہندوی، دہلوی، دکنی، گجری یا گجراتی کے مختلف ناموں سے پکارتے رہے۔ اس کی ابتدائی سرگزشت جہاں تک صحیح، تحریری روایتوں سے ملی ہم نے گزشتہ اوراق میں اجمالاً دہرائی ہے۔ حالیہ تحقیقات اردو کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں دور کر چکی ہیں۔ غالباً کوئی اہل علم اب "دکنی" کو اردو سے بے تعلق اور بیگانۂ محض نہیں سمجھ سکتا۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب یہاں تک تیار تھے کہ اس کے پرانے اور "متروک" الفاظ کو اردو کی لغت میں شامل کر لیا جاتے۔ شیرانی مرحوم کی عالمانہ سعی و تلاش نے اس کے ڈانڈے پنجاب، گجرات، حدود بہار و بنگال تک پھیلا دیے اور تیموری سلاطین کے آنے سے پیشتر اسے بولتے گیت گاتے سنا دیا ہے۔ مغل بادشاہوں کی حکومت میں اول اول فارسی کا پرچم لہرایا۔ دریا دلی، قدر شناسی کے جال نے ایران کے بہترین شاعروں کو اکبر آباد، دہلی، لاہور، احمد آباد کے حلقوں میں کھینچ بلایا۔ بادشاہ خود ایک زمانے تک فارسی، ترکی بولتے رہے لیکن پاکستان و ہند میں یہ بیرونی زبانیں قومی بولی نہ بن سکتی تھیں۔ مسلمان آبادی لاکھوں سے بڑھ کر کروڑوں کے اندازے میں آگئی تھی اور اہل ہند سے نہ صرف مخلوط ہوئی بلکہ عددی اعتبار سے مقامی عنصر غالب آتا جاتا تھا۔ یہ نو مسلم بیشتر، نفسی متصل

---

[1] جھوٹوک، ایریک حالات سنہ ۱۳۰ھ۔ میرے پیش نظر نسخے میں لودھی امیر کا نام علی خاں تحریر ہے۔ شاید کتابت غلط ہوئی جیسا کہ منتخب التواریخ میں صراحت آئی ہے۔ یہ گفتگو غالباً خود دولت خاں لودھی سے ہوئی تھی۔

[2] تاریخ داؤد شاہی (قلمی) ورق ۶۶

www.taemeernews.com

دلی والے کے پیشہ ور، خدمت گار یا ارباب نشاط سے تعلق رکھتے تھے لیکن سرکار، دربار میں اُن کا حکم نہ چلے، بازار میں کھیت کھلیان میں، گھر کنبے میں زبان ضرور چلتی تھی۔ درس گاہ، خانقاہ میں ہندی سے کام لیا جانے لگا تھا۔ دکن میں مغل بادشاہوں کے قدم دسویں صدی تک نہیں جمے مگر خود شمال میں اور ہمایوں کے پہلے دور میں ہم حکیم محمد یوسفی کو دیکھتے ہیں کہ صدہا ادویہ نباتات اور امراض کے نام ہندی میں ترجمہ کر رہے ہیں[1]۔ اکبری عہد میں ہندی کے ایک شاعر میر فاضل مجکری کا تذکرہ ملتا ہے ان کا کلام جو اس زمانے میں "بہت مقبول" تھا مفقود ہو گیا۔ سندھ میں اسی زبان ہندی کے مانوس و مقبول ہونے کی ایک گواہی ہم عصر تاریخ طاہری میں تحریر ہے کہ جانی بیگ ترخان کی فوج مغلوں سے شکست کھا کر منتشر ہونے لگی (سنہ ۱۰۰۰ھ) تو وہ اور اس کے سردار ہر طرف دوڑتے اور اپنے سپاہیوں کو "فارسی، ہندی، سندھی میں پکارتے اور غیرت دلاتے تھے[2]۔ ظاہر ہے کہ یہ ہندی سننے سمجھنے والے ہندوستان خاص کے لوگ نہ تھے بلکہ سندھ یا نواحی اقطاع کے باشندے تھے۔

انگریز کپتان ہاکنس جہانگیر کے عہد میں ہندوستان آیا تو یہ مشاہدہ کیے بغیر نہ رہا کہ فارسی درباری حلقوں تک محدود تھی باہر عام و خاص سبھی "ہندوستانی" بولتے تھے۔ صاحب "سب رس" نے بھی اسی زمانے (سنہ ۱۰۴۰ھ) میں اپنی رسیلی تحریر کو "زبان ہندوستانی" کہا ہے لیکن نام سے قطع نظر، یہی عہد ہے جب ضیاء الدین خسرو اپنے ہم وطن مسلمانوں کو فارسی سکھانے کے لیے "خالق باری" شائع کرتا ہے (سنہ ۱۰۳۱ھ) عہد میں اسی طرح کی کئی درسی کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ جن میں "اللہ خدائی" (سنہ ۱۰۶۰ھ) اور سب سے بڑھ کر "صمد باری" اتنی مقبول و متداول تھی کہ انقلابات کی آندھیوں میں بھی اس کے اوراق برباد نہ ہوئے[3]۔

صمد باری کا عرف عام "جان پہچان" اور درسی نام "رسالہ سہ زبان" تھا کیوں کہ وہ ہندی، فارسی، عربی تین زبانوں کا سبق دیتی تھی۔ مصنف، ملا عبدالواسع، ہانسی کے رہنے والے اور عالمگیری عہد کے خاصے مشہور مدرس تھے۔ کئی درسی رسالے ان کی یاد دلاتے ہیں مگر ذاتی حالات کا ابھی تک پتا نہیں چل سکا۔

حال آں کہ انصافاً اردو کے موسسین محسنین میں ان کا شمار ہوگا کہ جہاں تک معلوم ہو سکا، اس زبان کی پہلی لغت "غرائب اللغات" انہی نے تیار کی۔ اس میں وہ (ہندی) الفاظ جمع کیے ہیں، جو مسلمان عام طور سے

---

[1] پنجاب میں اردو۔ صفحہ ۱ [illegible]۔ نیز مقدمہ "حفظ اللسان، خالق باری" صفحہ ۹

[2] تاریخ طاہری قلمی فصل: جنگ جانی بیگ با خان خاناں عبدالرحیم۔

[3] ان پرانی "نصاب" کی کتابوں کے متعلق فاضل شیرانی مرحوم کی کتاب "پنجاب میں اردو" "مقدمہ حفظ اللسان خالق باری" اور دوسرے مقالات لائق مطالعہ ہیں۔ "خالق باری" کو سب سے اول انہی کی تحقیق دقیق نے مغلیہ عہد کی مخلوق ثابت کیا تھا۔ پھر ڈاکٹر عبدالحق مدظلہ کی جستجو کا ایک قدیم نسخے تک پہنچ گیا جس نے شیرانی مرحوم کی دقیقہ رسی اور دعوے کی قطعی تصدیق کر دی۔ یہ کتاب انجمن ترقی اردو نے کچھ عرصہ ہوا شائع کر دی ہے۔

www.taemeernews.com

پاتے مگر اُن کے عربی فارسی مرادفات نہیں جانتے تھے۔ یہ عجیب کتاب سوڈیڑھ سو صفحے سے زیادہ ضخیم نہیں، اس لیے "رسالہ" کہلاتی رہی۔ گیارہویں صدی کے اواخر یا اوائل بارہویں صدی کی تالیف، ہے سنہ ۱۱۶۵ھ میں سراج الدین علی خان آرزو کی تصحیح و توسیع سے اسے چار چاند لگے۔ ضخامت کوئی سہ گنی ہوگئی۔ "نوادرالالفاظ" کا نیا نام ملا۔ حال میں ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب (پروفیسر اورینٹل کالج، لاہور) نے بڑی دیدہ ریزی سے مطالعہ کیا، حواشی سے تزئین کی، انجمن ترقی اُردو نے چھپوا دیا ہے۔

تفصیلی لسانی بحث چھیڑنے کا یہ موقع نہیں مگر اُن ابتدائی لغات کو پڑھنے سے حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے اسلاف، ہندی میں کتنی مدت سے، کتنے گہرے ڈوب گئے تھے کہ ایسے بلیغ الفاظ اور مصطلحات ان کا وظیفہ تھیں جو اب ہماری تحریر و تقریر میں متروک اور حافظے سے معدوم ہو چکی ہیں۔ اسی حقیقت کو ذہن نشین کرنے سے ہم نظم اُردو یا ریختہ کی تیز ترقی اور قبولِ عام کی علم دریافت کر سکتے ہیں کہ بارہویں صدی کے آغاز میں حضرت ولی گجراتی (متوفی سنہ ۱۱۱۹ھ) کا دیوانِ ریختہ دہلی پہنچتا ہے اور دیکھتے دیکھتے بیسیوں ہم صفیر اسی لَے میں نغمہ سرائی کرنے لگتے ہیں۔ سبب یہ کہ زبان پہلے کے موجود و مروج تھی۔ کام لینے سے لوگ جھجکتے تھے۔ شہرتِ عام کے مطابق شاہ سعد اللہ گلشنؒ (متوفی سنہ ۱۱۲۵ھ) نے ولی کی ہمت بندھائی اور اپنی زبان میں فارسی طرز پر غزل کہنے کی تحریک فرمائی۔ شاہ صاحب موصوف دہلی کے ممتاز نقش بندی درویش اور خود بھی فارسی کے شاعر تھے۔

اسی مشرب کے دوسرے نامی بزرگوار جنھوں نے اپنی شعر گوئی سے نئی ریختہ کو نوازا مرزا جان جاناں مظہرؒ مشہور معاصرین مضمون، فائز، فغاں، تاجی وغیرہم میں شیخ ظہور الدین حاتم کو ایہام گوئی نے مشہور کیا۔ یہ لازمہ، شاعری کے اعتبار سے فضول چیز سہی، تاریخ کی نظر میں زبان کی وسعت اور نشو و نما کا منظر دکھاتے ہیں۔ حاتم ہی کے فیضِ تربیت نے سودا، یقین وغیرہ چند اوّل درجے کے ریختہ گو تیار کیے۔ اسی دور میں سراج دکنی، خواجہ میر درد دہلوی، نظیر و میر اکبر آبادی جیسے نامی گرامی افراد ہوئے کہ سارا ملک اُردو کے نغموں سے گونج اُٹھا اور فارسی شعر کہنے کی رسم پارینہ اور بے محل نظر آنے لگی۔

دہلی کی تباہی تاراجی نے اسی بارہویں صدی میں اکثر اُردو شعرا کو اودھ اور دوسرے صوبوں میں بکھیر دیا۔ خصوصاً لکھنؤ ثانیا مرکز بن گیا۔ ان شعرائے کے حالات سے اُردو تذکرے بھرے پڑے ہیں۔ کلام کے مجموعے، منتخبات کثرت سے شائع ہوئے اور زیرِ تنقید لائے جا رہے ہیں۔ خاص طور پر یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ درد و سودا کی اُردو، صرف دہلی، لکھنؤ سے مخصوص نہ تھی بلکہ لب لہجہ اور مقامی محاورے کے خفیف فرق کے ساتھ پاکستان و ہند کے بعید ترین صوبوں میں بولی اور نظم کے کام میں لائی جا رہی تھی ہر جگہ مقامی بولیاں موجود تھیں لیکن ہر جگہ کم سے کم مسلمانوں کی مشترک زبان وہی تھی۔ اورنگ آباد (دکن) اور والاجاہی ارکاٹ کی طرح میسور میں بھی اسی کے ترانے گائے جاتے تھے[1]

[1] "فتح المجاہدین" جو ٹیپو سلطان کے حکم سے سنہ ۱۱۹۷ھ میں تالیف ہوئی حال میں ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب (وزیر پاکستان) کی تصحیح سے شائع کر دی گئی ہے۔ اس میں کئی اُردو اشعار قطعات نقل کیے ہیں جنھیں میسوری سپاہی مختلف اوقات میں مل کر گاتے تھے۔

www.taemeernews.com

مرشدآباد میں دہلی کے سخن وروں کی آمد و رفت جاری تھی۔ میر جعفر کے بیٹے جواں مرگ میرن کی ایک منقبت قلمی تذکروں میں ملتی ہے جس کا نمونہ یہ ہے:۔

ہے نورِ خدا محرمِ اسرار پہ صلوات
سب اولیوں کے قافلہ سالار پہ صلوات[1]

اس سے کہیں بڑھ کر شعرائے سندھ خصوصاً میر حیدر الدین کامل (متوفی ۱۱۵۰ھ) اور ان کے تلامذہ کا کلام زبان دانی کی عمدہ مثالیں پیش کرتا ہے[2]

صوبہ سرحد (کوہاٹ) کے اسی عہد کے شاعر قاسم علی خاں آفریدی کا قلمی دیوان حال میں دست یاب ہوا جس میں فارسی اور پشتو سے کہیں زیادہ تعداد میں اُردو اشعار درج ہیں۔
نمونہ ملاحظہ فرمائیں ؎

کسی سے میں تری وصلت کی التجا کروں
مروں بہ رشک پہ اظہارِ مدعا نہ کروں[3]

---

[1] دہلی بارہویں صدی ہجری میں" ص۲۱ بحوالہ تحفۃ الاحباب (قلمی)۔
[2] دیکھو مقالہ سید حسام الدین صاحب راشدی۔ اُردو اکتوبر ۱۹۵۱ء
[3] دیکھو "اٹک کے اس پار" از فارغ بخاری و رضا ہمدانی ص۱۹۱ و مابعد